بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○

اُنیسویں صدی کا صُوفی

مؤلف

افتخار حسین وارثی کاکوروی

(رجسٹرار چیف کورٹ لکھنؤ)

مترجم

راشد عزیز وارثی المعروف فقیر مراد شاہ وارثی

(ایم۔اے علومِ اسلامیہ، تاریخ و مطالعہ پاکستان)

یکے از مطبوعات

مکتبۂ وارثیہ سنگھوئی، جہلم (پاکستان)

(اشاعتِ اوّل اردو ترجمہ ھذا: مارچ ۲۰۰۴ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد

الحمد للہ رب العالمین ○

الرحمٰن الرحیم ○

مالک یوم الدین ○

ایاک نعبد وایاک نستعین ○

اھدنا الصراط المستقیم ○

صراط الذین انعمت علیھم ○

غیر المغضوب علیھم والضالین ○ (آمین)

ترجمہ: (۱) سب تعریفیں اللہ ہی کیلئے جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کا۔ (۲) بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا۔ (۳) مالک ہے روزِ جزا کا۔ (۴) تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ (۵) چلا ہم کو سیدھے راستہ پر۔ (۶) راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام فرمایا۔ (۷) نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا۔ (سورۃ الفاتحہ۔ پارہ نمبر 1)

مدحتِ رسول ﷺ

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اُس نبی مکرم ﷺ پر اے ایمان والو! تم بھی آپ ﷺ پر درود بھیجا کرو اور (بڑے ادب و محبت سے) سلام عرض کیا کرو۔

(سورۃ الاحزاب۔ آیت نمبر:56 پارہ نمبر:22)

صَلُّوْا عَلَى الْحَبِيْبِ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ
وَّ اٰلِهٖ بِقَدْرِ حُسْنِهٖ وَجَمَالِهٖ ۝

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شان ولایت

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ
یَحْزَنُوْنَ ۝ صلے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا
یَتَّقُوْنَ ۝ لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا
وَفِی الْاٰخِرَۃِ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ
ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝

ترجمہ:

سنو! بے شک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ
غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (عمر بھر)
پرہیز گاری کرتے رہے۔ انہیں کیلئے بشارت ہے دنیوی زندگی
میں اور آخرت میں۔ نہیں بدلتیں اللہ تعالیٰ کی باتیں۔
یہی بڑی کامیابی ہے۔
(سورۃ یونس = آیت نمبر: 62, 63, 64 پارہ: 11)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بفیضانِ نظر

سرکار حضور عالم پناہ سیدنا **حافظ وحاجی وارث علی** شاہ قدس سرہ العزیز

دیوہ شریف (انڈیا)

زیرِ سرپرستی

حضرت الحاج فقیر **عزت شاہ وارثی** رحمۃ اللہ علیہ

منتظم اعلیٰ

آستانۂ عالیہ وارثیہ چھپر شریف (چنگابنگیال)

تحصیل گوجر خان۔ ضلع راولپنڈی (پاکستان)

اشاعت باہتمام

مکتبۂ وارثیہ: سنگھوئی، جہلم (پاکستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرفِ انتساب

نذرِ عقیدت و محبت بحضور

شبیہہِ وارثِ عالم نواز

حضرت الحاج فقیر **عزت شاہ وارثی** رحمۃ اللہ علیہ

سجا کر لختِ دل سے کشتیٔ چشمِ تمنا کو
چلا ہوں بارگاہِ عشق میں لے کر یہ نذرانہ

گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

خاکِ درِ حبیب

راشد عزیز وارثی المعروف فقیر مراد شاہ وارثی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

اللہ تبارک وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اسلام کی صورت میں ہمیں کامل ترین نظامِ حیات اور جامع ترین پیامِ رحمت ومحبت عطا فرمایا۔ یہ بنی نوعِ انسان کی تمام تر انفرادی و اجتماعی روحانی وجسمانی اور معاشی و معاشرتی ضرورتوں کا کفیل اور ترقیوں کا ضامن ہے۔ اسلام میں عقائد وعبادات اور معاملات کی اساس قرآن وسنت پر رکھی گئی ہے۔ قرآن وسنت پر مبنی شریعت کی پیروی ہر ذی شعور مومن مسلمان پر فرض ہے۔ اسلام کا تقاضا اپنے پیروکاروں سے تزکیہ نفس، خلوصِ نیت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے مطابق حسنِ عمل ہے۔

لیکن تقویٰ وپرہیز گاری، حسنِ عمل اور خلوصِ نیت جیسی ارفع واعلیٰ صفات سے متصف ہونا اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ بندہ اپنے تمام تر افعال واقوال پر اللہ کریم کو سمیع وبصیر اور شاہد وناظر تصور نہیں کرتا۔ اسی کیفیت کی طرف حضور نبی کریم ﷺ نے اس فرمانِ عالی شان میں اشارہ فرمایا کہ ”احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو (کم ازکم یہ تصور تو لازمی ہے کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔“

چنانچہ اسی احساس اور تصور بلکہ یقین سے کہ خالق ومالکِ کائنات میرے ہر قول وفعل سے واقف ہے اور ہر لمحہ مجھے دیکھ رہا ہے، انسان کو ظاہری وباطنی صفائی میسر آتی ہے۔ یہی حالت احسان ہے اور اسی کیفیت کا نام تصوف ہے۔

یہی وہ پیغام ہے کہ جو پیغمبر اسلام سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبےٰ ﷺ نے احسان کے نام سے صحابہ کرامؓ کو دیا اور اسی کی تعلیم حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر

فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، سیدنا علی المرتضیٰؓ شیرِ خدا، حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ، سیدہ فاطمۃ الزہراؓ، حضرت زین العابدینؒ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ اور جملہ اصحابِ صفہ نے دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی ''احسان'' کی تعلیم جب مختلف تشریحات و توضیحات کے ساتھ حضرت خواجہ اویس قرنیؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ، حضرت سیدنا غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے پیش کی تو تصوف کے نام سے موسوم ہوئی۔ اسی تصوف کی روشنی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ، سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ، شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ، حضرت نوشہ گنج بخش قادریؒ اور حضرت سیدنا حاجی وارث علی شاہؒ نے انسانیت کی اصلاح و فلاح کیلئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

حضرت سیدنا حافظ حاجی وارث علی شاہؒ نے احسان اور تصوف و طریقت کا یہ پیغام محبت کے نام سے اہل عالم تک پہنچایا۔ آپ روحانیت کی دنیا میں ایک عظیم سلسلہ، سلسلہ وارثیہ کے بانی ہیں۔ آپ کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کے مریدین پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ کے حالاتِ زندگی، کرامات اور تعلیمات پر مبنی بے شمار تصانیف اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ یہ کتاب ''انیسویں صدی کا صوفی'' دراصل یو۔پی کے ایک انگریز کمشنر کی قبلہ حاجی صاحب سے بے پناہ عقیدت و محبت کا مظہر ہے۔ جسے جناب ڈپٹی سید افتخار حسین رجسٹرار چیف کورٹ لکھنؤ (یو۔پی) نے مرتب کر کے شائع کرایا۔ یہ کتاب کافی عرصہ سے نایاب تھی۔ اب اسے دوبارہ وارثی احباب کی بے پناہ دلچسپی کے پیشِ نظر اردو ترجمہ کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اس کتاب کی اشاعتِ نو اور اس قدر خوبصورت اور عمدہ تزئین عکسِ جمالِ وارثِ عالم نواز حضرت الحاج فقیر عزت شاہ وارثی صاحب مدظلہ العالی کی بے پناہ محبتوں اور شفقتوں کی مظہر ہے۔ اللہ کریم پنجتن پاکؑ کے صدقے میں آپ کا سایہ شفقت و محبت ہمارے سروں پر قائم ودائم رکھے اور آپ میخانہ وارث الاولیاء سے عشق ومحبت سے لبریز جامِ عرفان آنے والوں کو پلاتے رہیں اور پینے والے سوز وگداز کی دائمی لذت اور کیف وسرور پاتے رہیں۔ آمین ثم آمین بحق سید المرسلین ﷺ۔

قیامت ہے رخِ زیبائے ساقی
زمانہ کیوں نہ ہو شیدائے ساقی
لگائیں کیوں نہ رند آنکھوں سے اس کو
کہ ہے اکسیر خاکِ پائے ساقی (نجمی ہرلاں)

مترجم کتاب ہذا

راشد عزیز وارثی المعروف فقیر مراد شاہ وارثی

سنگھوئی۔ جہلم (پاکستان)

1.1.2003

پیش لفظ

یہ مقالہ اولاً 1922ء میں ایک پمفلٹ کی صورت میں خان بہادر ڈپٹی افتخار حسین وارثی کاکوروی نے اس وقت کے یو۔پی (آگرہ۔اودھ) کے بورڈ آف ریونیو کے ممبر مسٹر برن کی ذاتی خواہش اور درخواست پر تحریر کر کے شائع کرایا۔ 1927ء میں مصنف نے اسے دوبارہ شائع کرایا۔اس کے بعد دیوہ شریف کے اس عظیم صوفی کی حیاتِ مبارکہ سے دلچسپی رکھنے والے احباب کی خاطر گورنر جنرل آف پاکستان مسٹر غلام محمد نے اس کی اشاعتِ نو کا انتظام کیا۔

رضی احمد

مینجر

آستانہ وارثی

دیوہ شریف

دسمبر 1954ء

تقریظ

(از: مرزا ابراہیم بیگ شیدؔا وارثی)

کتاب کا نام ''انیسویں صدی کا صوفی'' ہے جس کو نہایت شائستہ انگریزی میں خان بہادر مولوی افتخار حسین وارثی کاکوروی مرحوم رجسٹرار چیف کورٹ لکھنؤ نے تالیف فرمایا۔ لائق مؤلف نے بہ نظرِ اختصار حضور قبلۂ عالم کے بعض حالات و عادات کا ذکر اس رسالہ میں کیا ہے لیکن ہمارے رہنمائے مظہرِ انوارِ الٰہی کے ہر ایک معمولی واقعہ میں حقانیت و روحانیت کی غیر معمولی شان ہے۔ اس واسطے قرینہ ہے کہ یہ مختصر مجموعہ یورپ کے اس بلند حوصلہ طبقہ کے حق میں زیادہ مفید ثابت ہو جو اس وقت مذہبِ حقہ کا متجسس اور روحانیت کا گرویدہ ہے۔

سبب تالیف اس کا ایک مقتدر یورپین کا اشارہ ہے جو زبانِ حال سے اپنی ارادت کا اظہار اور عقیدت کا اقرار کرتا ہے اور حضور قبلۂ عالم کی عظمت و جلالت کی بہ آوازِ بلند شہادت دے رہا ہے۔ مسٹر برن ممبر بورڈ آف ریونیو جب بنارس کے کمشنر تھے اس زمانہ میں ان کو منجانب اللہ یہ خیال ہوا کہ ہندوستان کی وہ جلیل القدر اور کبیر الشان ہستی جس کی صورت و سیرت عین حقیقتِ عیسوی کی تصویر اور جس کا نورانی پیکر حقانیت کا مخصوص آئینہ ہے اس کے حالاتِ زندگی اعلیٰ پیمانہ پر مرتب کرنا ہماری سعادت کا باعث ہوگا اور اپنے اس خیال کو کامیاب بنانے کیلئے انہوں نے کوشش شروع کر دی۔ جو کتابیں اس مضمون میں شائع ہو چکی تھیں ان کو جمع کیا۔ تقریباً آٹھ دس فوٹو مختلف اوقات کے اس

لئے بہم پہنچائے کہ ہر عہد کے واقعات کی تمہید اس زمانہ کے فوٹو سے شروع کی جائے۔ دیوی شریف آئے۔عمارت آستانہ اقدس کا نقشہ طلب کیا۔تاریخ تعمیر جو کندہ ہے وہ نقل کی۔سیرت میں جو کتابیں موجود تھیں ان کو دکھائی گئیں۔لیکن شاید بجہت عدیم الفرصتی اس خدمت کو جب خود انجام نہ دے سکے تو کسی موقع پر مولوی افتخار حسین صاحب ممدوح سے سفارش کی کہ تم جناب حاجی صاحب قبلہ کی سیرت میں ایک رسالہ لکھو۔چنانچہ مؤلف موصوف نے اس فرمائش کی تعمیل میں یہ رسالہ تالیف فرمایا۔لہذا یہ رسالہ ایک باوقار یوریپین کی ارادت کا نتیجہ ہے۔

تعارف

یہ دستاویز درحقیقت 1922ء میں یو۔پی کی ہسٹاریکل سوسائٹی کے میگزین میں یو۔پی کے بورڈ آف ریونیو کے ممبر سر رچرڈ برن سی۔ایس۔آئی۔آئی۔سی۔ایس کی اس موضوع پر انتہائی زیادہ دلچسپی کے پیش نظر شائع ہوئی۔احباب کے اصرار نے مجھے اس کی دوبارہ اشاعت پر آمادہ کیا۔لہذا کچھ ضروری ترامیم و اضافہ کے بعد اب اسے موجودہ صورت میں پیش کر رہا ہوں۔

یہ سوال بجا طور پر اب بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں کہ جب عقیدے کے اندر روحانی عنصر کو اکثریت کیلئے برداشت کرنا مشکل سا ہو چلا ہے تو کیا اکثریت تصوف کے متعلق جاننے کی خواہش کر سکتی ہے (کیونکہ) میتھیو آرنلڈ کے بقول ''اکثریت بُری ہے''-----میں اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہوں کہ یہ مضمون ہر ایک کیلئے یکساں اہمیت کا حامل نہیں۔میرے خیال کے مطابق جو لوگ تمام رسوم و رواج کو ترک کر کے اپنا تعلق خصوصی طور پر انسان کی روحانی ترقی سے جوڑ لیتے ہیں۔اُن کا تعلق خواہ کسی بھی مذہب سے ہو۔وہ اس سلسلے میں تنگ نظر متعصب فرقہ وارانہ مذہبی گروہ کہ جو اس راہ میں اندرونی اور بیرونی ہر اعتبار سے روڑے اٹکاتے ہیں، کی نسبت کسی قسم کے کوئی دلائل طلب نہیں کرتے۔علیٰ ھذا القیاس ایک چھوٹا سا گروہ خواہ اُس کا تعلق کسی بھی مذہب و ملت سے ہو اگر وہ ان صفحات میں پیش کئے گئے عشق و محبت کے آفاقی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر مثال بنیں اور اس طریقہ سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیں تو مذہبی منافرت اور چھوٹے چھوٹے فرقہ وارانہ اختلافات میں نرمی کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں۔

سید افتخار حسین

جے پور

22 اگست 1927ء

باب اوّل

"معرفت کے میدان میں داخلے کے خواہش مند کیلئے لازم ہے کہ وہ اس میں یوں داخل ہو جیسے ایک چھوٹا سا بچہ آسمانی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔" (فرانسیس بیکن)

انیسویں صدی کے ربع اول میں جبکہ یورپ میں ریاستی جنگڑے اور شور وغل کم ہوا، جب ہندوستان میں مغلیہ حکومت کرب ناک زوال کی کیفیات سے دوچار تھی اور جب برطانوی حکومت کا دائرہ کار ملک کے دوسرے حصوں میں بھی انتہائی زیادہ تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اُس دور میں اودھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کی تعلیمات اور فرامین کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ بنی نوع انسان کی ناقابلِ یقین حد تک بے تہاشا تعداد کے مذہبی نظریات اور خیالات پر اثر انداز ہوں۔ آپ دیوہ شریف کے حاجی حافظ سید وارث علی شاہ صاحبؒ ہیں۔ دیوہ بارہ بنکی کے شمال میں ضلعی ہیڈکوارٹر سے سات میل کے فاصلے پر ایک قدیم قصبہ ہے۔ دوسرے قصبوں کی طرح یہ قصبہ بھی وقت کی غارت گری کے ہاتھوں بچ نہ سکا۔ بدنما کھنڈرات اور ٹوٹی پھوٹی دیواریں ہر طرف نظر آتی ہیں۔ مادی انحطاط کے ساتھ ساتھ اخلاقی تنزل بھی کچھ کم نہیں۔ کبھی یہ علاقہ متعدد عظیم صوفیائے کرام اور خدا رسیدہ بزرگان کی جائے پیدائش کے حوالے سے اچھی شہرت رکھتا تھا۔ لیکن اب بدمعاشی کے اڈوں، سازشوں اور مقدمہ بازی کے باعث سخت بدنام اور رسوا ہے۔

حاجی صاحب اودھ کی ایک مشہور و معروف اور جانی پہچانی شخصیت تھے اور آپ کا نام ایک گھریلو مانوس قسم کا لفظ تھا۔ بہت کم لوگ ایسے تھے اور اب تو بہت ہی کم ہیں کہ جو آپ کے حالاتِ زندگی سے آشنا نہ ہوں۔ آپ ایک حسینی سید گھرانے میں پیدا

ہوئے۔ جو علم و حکمت اور تقویٰ و پرہیز گاری میں ممتاز مقام کا حامل تھا۔ آپ کا شجرہ نسب (جو انتہائی محتاط انداز سے محفوظ کیا گیا ہے) ظاہر کرتا ہے کہ آپ حضرت امام حسینؓ کی چھبیسویں پشت میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ ماجد سید قربان علی شاہؒ قصبہ کے ایک متمول رئیس زمیندار تھے اور ایک انتہائی بلند پایہ عالم فاضل شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیم بغداد شریف میں مکمل کی تھی۔

حاجی صاحب کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں 1233ھ سے 1238ھ تک مختلف سنین بیان کیے جاتے ہیں۔ معارفِ وارثیہ (المعروف بہ مشکوٰۃ حقانیت از مولوی فضل حسین صدیقیؒ وارثی اناوی) کے مصنف کے مطابق درست تاریخ پیدائش 1234ھ کی ہے۔ جو بمطابق 1819ء ہے۔ آپ کا جو نام نامی اسم گرامی تجویز کیا گیا وہ اپنے اندر مخصوص اور عجیب و غریب معانی و مطالب سموئے ہوئے ہے۔ ''الوارث'' خدائے بزرگ و برتر کے ننانوے ناموں میں سے ایک (صفاتی نام) ہے۔ (جو قرآنِ پاک میں استعمال ہوئے ہیں) اس کے معنی یہ ہیں: وہ واحد و یکتا ہستی، مقدس کہ جس کی ذاتِ گرامی اس وقت بھی موجود ہوگی کہ جب اس دنیائے فانی کی ہر شے تباہ و برباد ہو جائے گی اور اس عالمِ رنگ و بو میں کسی وجود کا کوئی نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ یہ عہدِ قدیم سے صوفیائے کرام کا معمول چلا آ رہا ہے کہ مقامِ فناء کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو مقدس خدائی صفات میں سے کسی ایک کے ساتھ متصف کر دینا اور اپنے آپ کو اُس رنگ میں اس انداز سے رنگنا کہ وہ صفت بندے کی ذات و صفات پر مکمل طور پر غالب آ جائے۔ وہ صفت بندے کی انا اور نفس کو مکمل طور پر فناہ کر کے اس کو دائمی اور حقیقی معرفتِ خداوندی سے آشنا کرا دیتی ہے۔ یوں وہ بندہ اپنے آپ کو دنیا و مافیہا سے مکمل طور پر آزاد کرا لیتا ہے اور ترک کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ یوں اُس کے نام کی ایک غیر معمولی صورت گویا آج بھی موجود ہے۔ (جو اس صفت سے کامل طور پر متصف ہے اور فناہ کے اس مقام و

مرتبہ پر فائز ہے کہ جہاں) اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

ابھی آپ تین سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ کے والدین کا وصال ہو گیا آپ کی دیکھ بھال (اس قدر لاڈ پیار سے) یوں کی گئی کہ جیسے کسی غیر معمولی شیر خوار بچے کی کی جاتی ہے۔ پانچ سال کی عمر میں آپ نے قرآنِ پاک پڑھنا شروع کیا اور فقط دو سال کے قلیل عرصے میں اسے حفظ کر لیا۔ دوسری تعلیم پر آپ کوئی خاص توجہ نہ دیتے تھے۔ اگرچہ آپ اپنی کتابیں کبھی کبھاری پڑھتے لیکن آپ کے اتالیق کے لئے یہ امر انتہائی حیرت و استعجاب کا حامل تھا کہ آپ اپنا سبق ہمیشہ بالکل صحیح اور درست سناتے۔ آپ الہام سے سیکھتے ہوئے محسوس ہوتے۔ آپ گوشہ تنہائی میں محو و مستغرق رہنے کو کتابوں (کے مطالعہ) پر ترجیح دیتے اور اکثر دور دراز ویران و سنسان جگہوں کی طرف نکل جاتے۔ آپ کا زیادہ تر وقت خلوت و تنہائی میں غور و فکر میں گزرتا۔ ایک دفعہ جب آپ کو تلاش کیا گیا تو آپ ایک جنگل میں مراقب پائے گئے۔

آپ کبھی بھی اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے نظر نہ آتے تھے۔ لیکن آپ اُن پر انتہائی مہربان اور شفیق ضرور تھے۔ ان میں مٹھائی بانٹ کر اور غرباء میں روپے تقسیم کر کے بے حد مسرور ہوتے۔ آپ کو قصے کہانیاں سننا بہت پسند تھا اور شاعری بھی بڑے ذوق و شوق اور خوشی سے سنتے۔ تیراکی کا بھی آپ کو بہت شوق تھا۔

آپ کے سوانح نگار آپ کے تحصیلِ علم اور تعلیمی منازل و مراتب کے موضوع پر خاموش ہیں۔ تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ آپ نے کتابوں سے کوئی خاص اکتساب نہیں کیا۔ لیکن جب بڑی عمر میں بعض لوگ دور دراز سے آپ کے پاس آتے اور دینی مسائل پر بحث مباحثہ کرتے بلکہ بعض تو اس حد تک اس قدر دور تک چلے جاتے کہ اپنے متزلزل عقائد کی وجہ سے آپ پر اعتراضات کرتے اور جھوٹے الزامات تک لگا دیتے تو آپ اُن سے نزاع اور مناقشہ ہرگز پسند نہ فرماتے۔ آپ کے مختصر مگر جامع جوابات نہ صرف حریفوں کے منہ بند کر دیتے بلکہ متنازعہ موضوع پر آپ کے علم و ادراک

کا منہ بولتا ثبوت بھی ہوتے۔ آپ عربی، فارسی اور پشتو بھی بول سکتے تھے۔ غالباً آپ نے یہ زبانیں دورانِ سفر سیکھی ہوں گی۔

آپ کا معمول تھا کہ اکثر دیوہ شریف کے صوفی درویش شاہ عبدالمنعمؒ کے مزارِ اقدس پر حاضری دیتے اور کئی کئی راتیں وہاں عبادت و ریاضت میں گزارتے۔ آپ کے اردگرد موجود لوگوں کو جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ آپ اہلِ زمین میں سے نہیں ہیں۔ آپ کے بہنوئی حاجی سید خادم علی شاہؒ جن کا قیام لکھنؤ میں تھا۔ اس دور میں علماء و صوفیاء میں ایک نمایاں اور عظیم مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے بچے (حاجی وارث علیؒ شاہ عرف مٹھن میاں) کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی اور جب آپ گیارہ سال کی عمر کو پہنچے تو سید صاحب نے آپ کو بیعت فرما کر ضروری روحانی تربیت سے مزین کرتے ہوئے اسرار و رموز سے بھری پُر اسرار وادی میں داخل کر دیا۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا ہوگا کہ حاجی خادم علی شاہؒ واصل بحق ہوگئے اور ان کا روحانی ورثہ آپ (سیدنا حاجی وارث علی شاہؒ) کو تفویض کر دیا گیا کہ جن کے قدموں پر آنے والے وقتوں میں ہزارہا مخلوق جھکنے والی تھی۔ (حاجی خادم علی شاہؒ صاحب کا مزارِ مبارک کولا گنج میں واقع ہے۔ اب یہ کرسچین کالج لکھنؤ کے پرنسپل کی رہائش گاہ کے احاطہ میں ہے۔)

چودہ سال کی عمر میں آپ نے لوگوں کو اپنے حلقہ بیعت میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ یوں لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد آپ کے پیروکاروں میں شامل ہوگئی۔ عشقِ حقیقی کی دہکتی آگ نے آپ کا رخ ایک خاص سمت پہ متعین کر دیا۔ چنانچہ آپ ابھی صرف پندرہ سال کے ہی تھے کہ سفرِ حج پر مکہ مکرمہ کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔ آپ نے اپنی تمام جائیداد ایک گراں بہا لائبریری سمیت اپنے رشتہ داروں کے حوالے کر دی اور اپنی زمین جائیداد سے متعلقہ تمام دستاویزات کو ضائع کر دیا۔ جب آپ نے گھر چھوڑا تو تمام دنیاوی مال و متاع لٹا چکے تھے اور کوئی چیز ایسی نہ تھی جسے آپ اپنی ملکیت قرار دے سکتے۔

آپ کا طرزِ حیات درویشانہ (تجرد و تفرد والا) تھا۔ اس امر کی نشاندہی اس ریاضت و مجاہدہ سے بخوبی ہوتی ہے کہ آپ اس قدر چھوٹی سی عمر میں (مسلسل تین تین دن کا روزہ رکھتے اور) تین دن میں فقط ایک مرتبہ کھانا کھاتے۔ آپ نے مسلسل بارہ سال تک عرب، شام، فلسطین، عراق، ایران، ترکی، روس اور جرمنی کی سیاحت فرمائی۔ یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ آپ کی اس قدر طویل سیاحت کی کوئی تفصیلات ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔

آپ کے سوانح نگاروں نے بہت سے محیر العقول واقعات بیان کئے ہیں جنکا تذکرہ ہم دلائل و براہین کی کمی کے باعث یہاں نہیں کر رہے۔ آپ بذاتِ خود شاذ و نادر ہی کبھی اپنے بارے میں کچھ بیان فرماتے۔ ایک ساتھی سے کافی زیادہ بحث و تمحیص کے بعد خام مواد سے چند ایک چیزیں میں نے اکٹھی کی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس سفر کے دوران آپ نے دس مرتبہ حج بیت اللہ ادا فرمایا۔ ایک دن کعبۃ اللہ کے اندر آپ چند اشعار گنگنا رہے تھے جن کا پہلا مصرع یہ تھا کہ "عشق میں تیرے کوہِ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو" خدام کعبہ میں سے ایک آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا لگتا ہے کہ آپ بھول رہے ہیں کہ یہ خدا کا گھر ہے۔ آپ نے تیزی سے اُسے یہ دندان شکن جواب دیا کیا تم وہ جگہ بتا سکتے ہو جہاں خدا موجود نہ ہو۔

حج کی انتہائی اہم رسوم میں سے ایک یہ ہے کہ دورانِ حج عارضی طور پر (عام روزمرہ استعمال والے) کپڑے اتار کر احرام باندھ لیا جاتا ہے۔ (عام روزمرہ والے کپڑوں کی جگہ ایک اَن سلی چادر جسے تمام جسم کے گرد لپیٹا جاتا ہے۔ احرام کے نام سے موسوم کی جاتی ہے) حج کے بعد حاجی دوبارہ اپنا معمول کا لباس پہن لیتے ہیں لیکن حاجی وارث علی شاہؒ صاحب نے اپنے پہلے حج مبارک کے بعد احرام کو روزمرہ استعمال کے لباس کی حیثیت سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پہن لیا۔ بعد ازاں آپ نے ٹوپی اور جوتا بھی ہمیشہ کیلئے ترک فرما دیا۔ آپ نے بے شمار ممالک کی سیاحت فرمائی لیکن اس دوران

سوائے سمندر پار کرنے کیلئے کشتی یا جہاز کے، کبھی کسی گھوڑے یا گاڑی پر سفر نہ کیا۔ آپ نے سلطان عبدالمجید اول کے دور میں قسطنطنیہ کی سیاحت فرمائی۔ ایک دن حاجی صاحب محل کے باغات کی سیر و سیاحت کیلئے تشریف لے گئے۔ جس کا اہتمام آپ کے ایک مرید خاص (عبداللہ حاجب دربارِ شاہی) نے کیا تھا۔ اچانک سلطان وہاں آ پہنچا۔ وہ اس نورانی پیکر مقدس اجنبی کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوا اور آپ سے بیعت کی درخواست کی جسے آپ نے قبول فرماتے ہوئے اُس کو داخل سلسلہ فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے ان علاقوں میں، کہ جہاں کبھی اسلام پروان چڑھا اور استحکام پایا، عارضی قیام کے دوران ہزاروں افراد آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ یہ تصور بھی محال ہے کہ آپ کو اس قدر چھوٹی سی عمر میں تصوف کے میدان میں کس قدر بلند و بالا مقام و مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ آپ نے لوگوں میں وہ جوش و جذبہ پیدا کر دیا کہ آپ سے بڑی عمر کے لوگ آپ کے یوں تہِ دل سے معتقد ہو گئے کہ اپنی تمام عمر روحانی زندگی کیلئے وقف کر دی۔ آپ کو ہر مذہب و ملت کے مقدس مقامات پر خوش آمدید کہا جاتا اور سب سے زیادہ برگزیدہ خیال کیا جاتا۔ تاریخ تصوف اس امر کی کوئی اور مثال دینے سے قاصر ہے کہ آپ کے علاوہ کبھی کوئی اور ایسا کم عمر درویش اس قدر جلد اور خصوصاً دور دراز ممالک میں مرکز نگاہ بن گیا ہو۔ آپ نے اپنے پیدائشی اور خلقی عشقِ الٰہی کے ساتھ اپنی ذہنی قوتوں کو مجتمع کر کے وہ روحانی مقام پا لیا جو دوسرے صوفیانہ مذاہب و مسالک میں کئی کئی سال کے سخت مجاہدوں اور ریاضتوں کے بعد حاصل ہوتا تھا۔

یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ برلن (جرمنی) کی سیاحت کے دوران حاجی صاحب پرنس بسمارک (بانی جرمن ایمپائر) کے مہمان رہے۔ ہم اس بات کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ مستقبل کے سیاستدان اور خدا کے ایک عاجز و منکسر بندے کی آپس میں ملاقات کیونکر ہوئی اور ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی۔

آپ حجِ بیت اللہ کیلئے ہندوستان سے سات مرتبہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔

ان میں سے تین مرتبہ یہ سفر افغانستان کے سنگلاخ چٹیل خوفناک پہاڑوں کے راستے ننگے پاؤں گزرتے ہوئے پیدل طے فرمایا۔ جب آپ تقریباً دس سال کے بعد وطن واپس لوٹے تو آپ کے اپنے لوگ بھی آپ کو پہچان نہ سکے۔ آپ کا آبائی مکان کھنڈر بن چکا تھا۔ آپ نے تمام گاؤں کا چکر لگایا۔ لیکن کوئی بھی ایک فقیر کو خوش آمدید کہنے آگے نہ بڑھا۔ آپ کے کچھ عزیز و اقارب نے تو آپ کی آمد کی خبر سن کر بالکل ہی کنارہ کشی اختیار کر لی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ان سے اپنی جائیداد کا مطالبہ ہی کر دیں۔ جس پر انہوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ آپ اُن کی سرد مہری پر مسکرائے اور فرمایا کہ ''اُن کا خیال ہے کہ ہم اپنی جائیداد کے حصول کی خاطر واپس آئے ہیں۔ ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں۔'' آپ بہت جلد وہاں سے چلے گئے اور اپنی مسافرانہ زندگی پھر سے شروع کر دی۔ آپ غالباً 1857ء میں لکھنؤ واپس تشریف لائے۔ جہاں چند لوگوں نے آپ کو بغاوت سے قبل دیکھا۔ آپ نے تقریباً پچاس سال یا اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ سیاحت میں گزارا۔ لیکن اس دور کے بہت کم حالات منظرِ عام پر آئے۔ یہاں تک کہ 1899ء میں آپ نے واپس تشریف لا کر اپنے مریدین و محبین کی استدعا پر دیوہ شریف میں مستقل قیام منظور فرما لیا تاہم اس کے بعد بھی اپنے آبائی علاقہ کے گرد و نواح میں اکثر و بیشتر مختصر وقت کیلئے تشریف لے جاتے۔

حاجی صاحب کی طرزِ زندگی تارک الدنیا ہونے کے باعث بالکل مجردانہ رنگ اختیار کر گئی تھی۔ یہ گوشہ نشینی کی کیفیت یقیناً آپ کے حسبِ حال تھی۔ کیونکہ جو عین عالمِ شباب میں عشقِ حقیقی میں فنا ہو کر دنیا و مافیہا سے دست بردار ہو جائے اس کیلئے اس کے علاوہ اور کونسا طرزِ حیات ہو سکتا ہے۔ لیکن انسانی جذبات کی قربانی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کا دل سوز و گداز سے خالی تھا۔

آپ چونکہ ہر وقت محوِ ذات رہتے تھے چنانچہ غور و فکر اور انہماک و استغراق کے باعث بہت کم اور مختصر گفتگو فرماتے۔ آپ نگاہیں نیچی کئے تیز مگر دھیمے لہجے میں گفتگو

فرماتے۔آپ اکثر اپنی بات کے معانی ومفاہیم پر زور دینے کیلئے اپنے الفاظ کو دہراتے۔ گو آپ کی گفتگو بغض وحقارت سے پاک، سادہ اور مختصر ہوتی لیکن آپ احساسِ ظرافت سے بے بہرہ نہ تھے۔گویا آپ ابو سینا کی بیان کردہ عارف کی تعریف کی بہترین مثال تھے کہ العارف فرحون بشاشون بسمون (یعنی ایک عارف کے چہرہ پر ہمیشہ فرحت، بشاشت اور مسکراہٹ ہوتی ہے۔)۔آپ کا اندازِ تکلم نہایت شگفتہ تھا۔دورانِ گفتگو اکثر مسکراتے مگر یہ مسکراہٹ کبھی قہقہے کی حد تک نہ بڑھی۔غرباء ومساکین کو آپ خصوصی توجہ شفقت اور مہربانی سے نوازتے۔آپ کا عمومی رویہ بھی انتہائی عجز وانکساری کا حامل ہوتا۔آپ کا ظاہر آپ کے باطن کے عین مطابق تھا۔آپ کے خدوخال انتہائی حسین وجمیل تھے۔پیشانی مبارک دانشورانہ اور مدبرانہ نشانیوں کی حامل اور غیر معمولی حد تک کشادہ تھی۔لیکن آپ کے حسن وجمال کی کشش کا اصل مرکز آپ کی آنکھیں تھیں جو انتہائی مسحور کن، دلکش اور ایسی متاثر کن مقناطیسی قوت کی حامل تھیں کہ جن کے وار سے کوئی بچ نہ سکتا تھا۔جب آپ کسی ہجوم یا مجمع کے ساتھ چل رہے ہوتے تو آپ کا سرِ اقدس سب سے بلند نظر آتا۔آپ کبھی کرسی یا صوفہ پر تشریف فرما نہ ہوئے اور نہ ہی کبھی چارپائی یا پلنگ استعمال فرمایا۔آپ ساری زندگی فرش پر آرام فرما ہوئے لیکن بغیر تکیہ کے۔آپ کے بعض مریدین کا بیان ہے کہ آپ کو کبھی غفلت کی نیند سوتے ہوئے نہیں پایا گیا۔

اگر آپ کبھی کسی ایک سڑک یا رستے سے گزرتے تو پھر جب بھی دوبارہ آپ کا گزر اس جگہ سے ہوتا تو دوبارہ اسی رستہ سے تشریف لے جاتے۔اگر آپ کو کسی دوسرے رستے سے لے جایا جاتا تو فوراً واپس آتے اور اسی پرانے رستے پر چلتے۔اسی طرح دورانِ سفر جائے قیام اور انتخاب میزبان کے متعلق بھی سختی سے وضعداری پر کاربند رہتے۔یہ صفت (وضعداری) اُن نایاب اخلاقی خصوصیات میں سے ایک ہے جن سے دائمی تعلقات اور پرخلوص مراسم پروان چڑھتے ہیں۔آپ کے نزدیک کسی شخص سے

ایک مرتبہ کی ملاقات ہمیشہ کی ملاقات کے مترادف تھی۔آپ محرم الحرام کے ابتدائی دس دنوں میں غیر معمولی خاموشی اختیار فرمالیتے۔تاہم آپ مرثیے سننا پسند فرماتے۔لیکن آپ تاکید فرماتے کہ خوش الحانی کے ساتھ سانحہ کربلا کے حقیقی واقعات بیان کئے جائیں۔ آپ ظاہری دکھاوے کے ماتم کی حوصلہ شکنی فرماتے۔جب تعزیہ آپ کے آستانہء مبارک کے پاس سے گزرتا تو آپ اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے اور بعض اوقات تعزیہ کے ساتھ بھی جاتے۔آپ محرم الحرام کے دوران موسیقی (قوالی) ہرگز نہ سنتے۔دوسرے اوقات میں جب سماع کا اہتمام ہوتا تو کبھی آپ پر وجد و حال کی وہ کیفیات نہ دیکھی گئیں جو عموماً کم درجے کے صوفیوں پر وارد ہوتی رہتی ہیں۔

درج بالا سطور میں آپ کے روزہ کے معمول کے حوالہ سے بات ہو رہی تھی۔ آپ پندرہ سال سے چالیس سال کی عمر مبارک تک سات دنوں کا روزہ رکھتے رہے اور ساتویں دن افطار کرتے۔بعد ازاں یہ وقفہ تین دن کا ہوگیا۔پچاس سال کی عمر میں آپ اکثر بیمار رہنے لگے۔چنانچہ آپ کے معالجین نے اصرار کیا کہ آپ دن میں دو مرتبہ غذا ضرور استعمال فرمایا کریں۔آپ نے ان کا مشورہ قبول فرمایا لیکن اس پر عمل برائے نام ہی تھا۔آپ نے اپنی مثال کے ذریعہ یہ ثابت فرمادیا کہ آدمی صرف غذا کے سہارے ہی نہیں بلکہ فقط خدا کے سہارے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔

☆☆☆

باب دوم

آپ کی صوفیانہ تعلیمات بیان کرنے سے قبل تصوف کے متعلق کچھ بیان کرنا غلط نہ ہوگا۔ یونانیوں کے ''صوفیانہ اسرار و رموز'' (یہ ایتھنز کے مہذب اور باشعور شہریوں کی ایک ایسی تنظیم تھی کہ جس کے اندر صرف صاحبانِ اسرار سالکین حق کو داخلہ دیا جاتا تھا۔ وہ مذہب کے مشہور اور سرسری تصورات کی بجائے ذاتِ حق کے زیادہ قریبی تصور اور مشاہدہ کے تمنائی تھے۔) کے برعکس یہاں کسی قسم کے کوئی اسرار و رموز نہیں ہیں۔ ابتدائی دور کے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کی زندگیوں کے گرد داستانوں اور اسرار کا ایک ایسا ہالہ قائم ہے جس میں تصوف کے ساتھ مافوق الفطرت تصورات و کیفیات کو وابستہ کر دیا گیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے عوام کی نگاہ میں فری میسنری تحریک کو جادو کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ تصوف کی بنیاد کسی چیز کی شدید طلب اور خواہش کیلئے محض رسوم ورواج کی بجائے راسخ الاعتقادی پر ہے۔ ابن خلدون نے مقدمہ میں اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھیوں اور پیروکاروں میں تصوف کے اہم اور بنیادی اصول وضوابط اسی دور میں رائج ہو گئے تھے لیکن دوسرے دور میں جب مسلمانوں میں مادیت پرستی پیدا ہو گئی تو وہ صاحبان جو مذہبی رجحان رکھتے تھے انہوں نے تقویٰ و پرہیزگاری اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ انہوں نے اپنا ایک علیحدہ حلقہ قائم کر لیا۔ جنہیں عرف عام میں صوفی کہتے تھے۔ (صوفی کی اصطلاح پہلی دفعہ کرا کے ابو ہاشم (دوسری صدی ہجری / 800 سن عیسوی) کیلئے استعمال کی گئی۔ اگرچہ حسن بصریؒ کو کچھ مستند روایات کے مطابق اس تحریک (تصوف) کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔)

جامی کہتے ہیں کہ ابو ہاشم کی زندگی میں صوفیا کی پہلی خانقاہ ایک شریف النفس عالی مرتبہ عیسائی کے ہاتھوں تعمیر ہوئی۔ یہ اسلام میں راہبانہ طرزِ حیات کی ابتداء تھی جو

اگر چہ پیغمبر ﷺ اسلام کی تعلیم کے خلاف تھی کہ ''اسلام میں راہبانیت نہیں۔'' یہ صوفیاء کے ذریعے تصوف کا حصہ بن گئی۔ یہ غالباً آرام کی زندگی اور گوشہ نشینی کی خواہش ہوگی جو بالآخر انتہائی صورت میں مکمل طور پر ترکِ دنیا کی شکل اختیار کر گئی۔ لیکن صوفیائے کرام کی اکثریت دنیا میں قیام کرنے پر یقین رکھتی تھی نہ کہ اس سے تعلق رکھنے پر۔ آغاز میں اُن کو بہت زیادہ تمسخر و تضحیک کا نشانہ بنایا گیا اور وہ لوگ جو قانون کی روح کی بجائے فقط اس کے الفاظ کے سرسری عامل تھے وہ انکی اس روش پر اعتراض کرتے تھے جیسا کہ آج کچھ مسلمان طبقے یا فرقے کر رہے ہیں۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ان لوگوں کو اپنی صفوں میں مشہور فقیہہ اور عارف دکھائی دینے لگے۔ امام شافعیؒ (ایک عظیم مسلم فقیہہ) کہتے ہیں کہ تمام اہلِ عالم کا مجموعی روحانی علم بھی اُن کے علم کی برابری نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی یہ علم صوفیاء کے علم سے کم ہے۔ تیسری صدی ھجری میں تصوف کے عقائد و نظریات میں خاطر خواہ ترقی ہوئی اور اس گروہ کے چند ایک انتہائی ترقی پسند عناصر کا خانقاہی نظام کے سرپرستوں اور رہنماؤں سے تنازعہ شروع ہو گیا۔ جو بالآخر منصور ابن حلاج کیلئے سزائے موت کا حکم صادر ہونے پر اپنے انجام کو پہنچا۔ یہ کہانی زبان زدِ عوام ہے کہ کس طرح اس کا جواز تلاش کیا گیا۔ ان سے منسوب انتہائی خوبصورت اقوال میں سے ایک یہ ہے کہ جو کوئی خدا کی پرستش کسی عام رسمی مذہب کی روشنی میں کرتا ہے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی سورج کو ستاروں کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ جو کہ قرونِ اولیٰ کے انتہائی عظیم اور ممتاز صوفی تھے ان کے مطابق کسی درویش کی پرکھ اور پہچان کرامت کا اظہار نہیں بلکہ تقویٰ و پرہیز گاری کی سنہری اور سچی زندگی ہے۔ اندر کی روشنی کی طلب اور چاہت نے اسلامی دنیا کے قلوب اور خیالات میں گھر کر لیا اور تصوف مذہبی حلقوں میں جنون کی حدوں تک جا پہنچا۔

مشرق اپنے تصوف کی وجہ سے بہت مشہور و معروف ہے۔ اسلام کی آمد سے قبل تصوف صرف قدیم ہندوؤں میں ہی رائج نہ تھا بلکہ عیسائیوں میں بھی عام تھا۔ اس

توجیہہ کی وجہ شاید یہ ہے کہ مغربی مصنفین یہ تصور پیش کرتے ہیں کہ تصوف ویدانت کے فلسفہ (علمِ حاضرات) یا نوافلاطونیت سے اخذ کیا گیا ہے۔ ابنِ خلدون کی عظیم سند (جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) نے اس نظریہ کی مکمل طور پر تردید کردی ہے کہ تصوف دامنِ اسلام پہ لگایا گیا ایک پیوند ہے۔ اس اختلاف کی اصل وجہ عام مسلمانوں کے خیالات ہیں۔ حالانکہ تصوف کی بنیاد کسی بیرونی چیز پہ نہیں بلکہ مکمل طور پر قرآنِ پاک کی تعلیمات پر ہے۔ وہ عظیم شخصیت کہ جنہوں نے سب سے پہلے تصوف کو ایک مستقل شکل دی حضرت امام غزالیؒ تھے۔ جو پانچویں صدی ھجری میں ہوئے ہیں۔ آپ تصوف کو محض راہبانیت سے ممیز کرنے کے متمنی تھے۔ لہذا آپ نے تصوف کو راسخ الاعتقادی کے ساتھ اتحاد اور انس سے منسلک کیا اور اسے الہامی اور الہیاتی بنیادوں پر متعین کیا۔ لیکن تصوف محض عالمِ ارواح کے مطالعہ کا نام ہی نہیں بلکہ کائنات کی حقیقت تک پہنچنے کا ایک عملی طریقہ ہے۔ اس گروہ کی محض تاریخ جان لینا ہی کافی نہیں بلکہ اس میں بصیرت سے اکتساب کیا جانا چاہیئے۔ تصوف کا سب سے پہلا سبق یہ ہے جو عام آدمی کی دسترس سے باہر ہے کہ فناہ کی منزل ذوق وشوق کے ساتھ تقویٰ سے منسلک ہے۔ لہذا طریقت کے اسرار ورموز فقط چند ایک اُن منتخب افراد کو عطا کئے جاتے ہیں جن میں روحانی ترقی کی خواہش اور صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانیت پر اسرار کا ایک پردہ ہمیشہ موجود رہا ہے۔

صوفیاء کے دائمی ابدی اور آفاقی پیغام کی بنیاد محبت پر ہے۔ یہ لفظ اُن کی طرف سے بڑے تکنیکی انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ مولانا رومؒ کے مطابق یہ وہ جوہر ہے جو غیر مرئی ذرات کی صورت میں مرتب کیا گیا ہے جو کہ ایک دوسرے کے درمیان (باہمی) کشش کا ذریعہ بنتا ہے۔ (مولانا جلال الدین رومیؒ (604ھ تا 672ھ) جو کہ تصوف میں ایک بہت بڑی اتھارٹی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ نے اپنی مشہور مثنوی میں ایسے نظریات پیش کئے ہیں جو کششِ ثقل اور قانونِ ارتقاء سے مطابقت رکھتے ہیں۔

آپ نے انسان کی ابتداء کا تعلق مادے سے جوڑا اور ارتقاء کی ان منازل کا تذکرہ کیا جن سے انسان آج تک گزرا ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ایک صوفی نے ان نظریات کو (چاہے وہ کتنی ہی ابتدائی شکل میں کیوں نہ رہے ہوں) نیوٹن اور ڈارون کے پیدا ہونے سے صدیوں پہلے دریافت کیا اور ان سے بحث کی۔ یہ معاملہ مغربی سائنسدانوں اور ہمارے طالب علموں کی نوجوان نسل کیلئے قابلِ توجہ ہے۔ چنانچہ ایمانداری کا تقاضا یہ ہے کہ مشرقی صوفیاء کو فطرت کے قوانین کا زیادہ حقیقی عالم تسلیم کیا جائے) یہ قانون نامیاتی میدان میں موجود ہے۔ آپ نے ابدان کے باہمی میلان اور ایک دوسرے سے محبت کے رجحان کی وضاحت کی ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ انسان مادے سے ترقی پا کر ارتقاء کی انتہائی صورت کو پہنچ کر اسباب کے ساتھ ودیعت کیا گیا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ "خدا کی محبت کو صحیح طور پر سمجھنا بہت مشکل امر ہے۔ کیونکہ علماء کا ایک گروہ تو اس بات سے سختی سے انکار کرتا ہے کہ انسان اس سے پیار کر سکتا ہے جو اس کی صنف سے تعلق ہی نہیں رکھتا۔ وہ خدا کی محبت کی حدود قائم کرتے ہیں کہ اس کی فقط فرمانبرداری کی جا سکتی ہے۔ اس کی محبت فقط اس کے علم سے حاصل کی جا سکتی ہے۔" لیکن اس محبت کی بڑی وجہ، جس کی وضاحت کی گئی ہے یعنی انسان کا قربِ الٰہی پانا جس کا حوالہ اس حدیثِ نبوی ﷺ میں ملتا ہے: ان اللہ خلق آدم علی صورتہ (مشکوٰۃ شریف) ترجمہ: درحقیقت اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا۔

تصوف میں عملی تربیت کیلئے ضروری ہے کہ صحیح طور پر ترکِ دنیا کی مشق کی جائے اور روحانی پیشوا یا شیخ کی رہنمائی میں صوفیائے کرام کے احکامات کی تعمیل کی جائے۔ کوئی بھی شخص گیان دھیان (ارتکازِ توجہ، تصورِ شیخ) کے ذریعہ اسی وقت قربِ خداوندی حاصل کر سکتا ہے جب اس کا ذہن طویل مجاہدہ کے باعث صاف ستھرا اور پاکیزہ ہو چکا ہو۔ اس عظیم معاملہ کا انحصار شیخ کے کردار پر ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ پہلے شیوخ اعلیٰ قسم کے تقویٰ و پرہیزگاری اور علم و عرفان کے حامل ہوتے تھے لیکن اسلام کی صحیح روح اور حقیقی علم

کے زوال کے باعث طریقت کا روایتی تقدس مخالف قوتوں کے خلاف اپنا دفاع نہ کر سکا۔

عصر حاضر میں شیخ اور پیر کہلانے والوں نے شیرینیوں، چڑھاووں اور نذر و نیاز کا طریقہ کار متعارف کرایا۔ جو اُن کے پیش رو بزرگان کے طریقہ کار کے خلاف اور (ان کی تعلیمات کے) بالکل برعکس ہے۔ ان کے اس آزادانہ نذریں قبول کرنے کے عمل نے انہیں آرام و آسائش اور تعیشات کی زندگی سے متعارف کرادیا۔ اس چیز نے کٹر قسم کے علماء کے حسد کو ابھارا جو مشکوک فتوے جاری کر کے اور مساجد میں نمازیں پڑھا کر مشکوک روزی کماتے تھے۔ اُن کے باہمی نقصان کی وجہ سے جو لائن ان دونوں پارٹیوں کو تقسیم کرتی ہے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور زیادہ گہری ہوگئی۔ صوفیاء نے علم سے ہاتھ کھینچ لیا اور علماء نے روحانیت سے۔ اخلاقی و باطنی صفائی اور پاکیزگی اور اسلاف کی رواداری و بردباری چھوڑ دی۔ دنیاداری کی طرف میلان نے اس گروہ کا تمام کردار ہی بالکل تبدیل کر کے رکھ دیا۔ (زوال اور نقصان کے) ان اسباب کے سلسلہ کی ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ جو اس کے بلند اخلاقی معیار پر اثر انداز ہوئی وہ ایرانی شعراء سے اخذ کردہ ہے یعنی بندوں کی محبت کا سا انداز بیان خدا کی محبت کیلئے استعمال کیا۔ یہ تمثیل ناموزوں ماحول کے اندر جب مناسب حدود سے تجاوز کر گئی تو طریقت کے سلسلہ کو اس سے سخت نقصان پہنچا۔ بڑے بڑے مشائخ بھی پیشہ ور پیروں کی صورت میں شرافت کھو بیٹھے ہیں۔ تیسرے درجہ کے لوگ جو جنت کے پاسپورٹ دینے کا دعویٰ کرتے ہیں اور مریدین کی خوش اعتقادی بلکہ ضعیف الاعتقادی کی بنیاد پر اپنا سارا کاروبار چلاتے ہیں۔ جن کے اخراجات پر وہ کھاتے پیتے پلتے اور بگڑتے جاتے ہیں۔ وہ بھی بہت سے نئے نئے طور طریقے متعارف کراتے رہتے ہیں۔ جیسے قبروں اور مزارات کی پوجا و پرستش۔ جو کہ تمام تر اسلامی تعلیمات کے بالکل قطعی طور پر خلاف ہے۔ یہاں پر یہ بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ بہت زیادہ دینی علم (جو کہ اب کم ہو چکا ہے) تصوف کی عملی زندگی میں بصیرت کے حصول کیلئے ضروری نہیں۔ بلکہ زیادہ ضروری چیز خدا کی سچی

محبت اور روحانی ترقی کیلئے جوش وجذبہ (اور سچی طلب) ہے۔

روحانیت کی جو شکل یورپ اور امریکہ میں پیش کی جاتی ہے وہ مشرقی صوفیاء کی روحانیت سے بالکل مختلف ہے۔ ان ممالک میں یہ فقط میز کے گرد گھومتی ہے اور اس کا مقصد روح پر ضرب لگانا اور مرے ہوئے لوگوں کی ارواح سے کسی ذریعہ سے رابطہ قائم کرنا ہے۔ اس ملک میں لوگ روحانی مفکرین سے واقف وشناسا ہیں۔ لیکن تصوف میں ایسی مشقوں سے وابستگی غلط ہے۔ یورپی ارواحیت پرستوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا ہے کہ روحانی مفکرین کے حلقے محض ہنسی مذاق ہیں۔ جن کی بنیاد شعبدہ بازی اور فریب پر ہے۔ یہ فنون لطیفہ کے قدر دان منطق اور استدلال کے ذریعہ روحانیت کے میدان میں تجربات کرتے ہیں۔ روح کی نقل مکانی کے بارے میں اور روح کے خالق کائنات کے ساتھ مابعد الطبعیاتی تعلق کے بارے میں، کیا فرق ہے آدمی کی عمدہ حالت اور کم درجہ کی حالت میں یا انسانی بھلائی کیلئے کیا تجویز کیا جاتا ہے، جن کا تعلق عام اخلاقیات کے میدان سے ہے لیکن جب کوئی اعلیٰ روحانی مقام کے حصول کیلئے اپنی ذات کو بھول جاتا اور اپنی خواہشات نفسانی کو قربان کر دیتا ہے تب وہ کہہ سکتا ہے کہ ذاتِ خداوندی کا حقیقی علم حاصل ہو گیا ہے۔ یہی وہ بات ہے کہ جو تصوف، سکھانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بعد میں مغربی نظریات کی رَو اور خصوصاً یونانی فلسفہ کے باعث تصوف میں جو شرکانہ رجحان آیا وہ قدیم تصوف میں موجود نہ تھا۔

سپنزا کے مطابق ''خدا کو جاننا اس حد تک کہ ہم اسے جان سکیں یہی طاقت ہے یہی ذاتی حکمرانی ہے اور یہی امن وسکون ہے۔'' حاجی صاحب خدا کی ایسی ہی پہچان رکھنے والے لوگوں میں سے ایک ہیں جیسی کہ پہچان ہونی چاہیئے۔ آپ کسی نئے گروہ یا فرقے کے بانی نہیں تھے بلکہ آپ ایک غیر معمولی صلاحیت اور نیکی کی علامت تھے۔ آپ کے سلسلہ کا مرکزی خیال ''مقدس خدائی اور آفاقی محبت'' ہے۔ ایک انگریز شاعر اس خیال میں ان الفاظ کے ساتھ روح پھونکتا ہے وہ کہتا ہے کہ ''محبت عدالت، گھر اور قبر

سب جگہ حکومت کرتی ہے۔ محبت کیلئے جنت ہے اور جنت کیلئے محبت'' یہ محبت ہی تھی جس نے عظیم رومی کی روح کو آگ لگا دی اور وہ بے ساختہ بول اٹھے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما
اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

(اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو جاتے ہیں۔ تجھ سے سب امراض کا علاج ہو جاتا ہے۔ تجھ سے نخوت و ناموس کا علاج ہوتا ہے۔ عشق کو اس عار و ننگ کے رفع کرنے میں بہ نسبت دوسرے اخلاقِ ذمیمہ کے ایک خاص صفت حاصل ہے کیونکہ عشق کیلئے ذلت لازم ہے اور ذلت اور ناموس جمع نہیں ہوتے ایک کے غلبہ سے دوسرا جاتا رہتا ہے۔ لہذا اے عشق تو ہی میرے لئے معالج و حکیم افلاطون و جالینوس کی حیثیت رکھتا ہے)

یہ ایک دلچسپ چیز ہے کہ ہم آج کے مغربی ارواحیت پرستوں کی تحریروں میں قدیم صوفیانہ نظریات کی صدائے بازگشت کا جائزہ لیں۔ ایک مشہور و معروف امریکن مصنف رالف والڈو ٹرائن ''ذاتِ لامحدود کے ساتھ ہم آہنگی'' میں تصوف کے متعلق کہتے ہیں: ''جس لمحے ہم اپنے آپ کو بصد ذوق و شوق پہچان لیتے ہیں تو محبت سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ پھر ہمیں ہر شے میں فقط حسن ہی حسن نظر آتا ہے اور جب ہمیں یاد آتا ہے کہ ہم سب ایک لامحدود روح کے ساتھ یکساں وابستہ ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم سب تو باہم متصل ہیں۔ سب کی زندگی ایک ہی جیسی ہے۔ پھر تعصب جاتا رہتا ہے اور بغض و عناد اور نفرت ختم ہو جاتے ہیں۔ محبت پھلتی پھولتی ہے اور اسی کا اقتدار اعلیٰ قائم ہوتا ہے۔''

حاجی صاحب اپنے مریدین کو ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم سے محبت کرو اور ایک

دوسرے سے محبت کرو اور اسی نکتہ پر بے پناہ زور دیتے ہیں۔

ایک صوفی علم و عرفاں کے رستے پر جس منزل کے حصول کیلئے کوشاں ہوتا ہے اس کیلئے کئی منازل طے کرتا ہے لیکن حاجی صاحب اس راہ میں دیگر صوفیائے کرام کی مانند منزل بہ منزل نہیں بڑھے بلکہ کہا جاتا ہے کہ آپ جوانی میں بھی روحانی علوم میں اتنے ہی ماہر تھے جتنے کہ اپنی زندگی کے اختتام پر تھے۔ لہٰذا اسی وجہ سے آپ کو مادرزاد ولی اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کو حضرت علی المرتضیٰؓ سے بلاواسطہ روحانی فیض حاصل تھا۔ جن کے بارے میں صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے کہ انہوں نے روحانی تربیت پیغمبر اسلام حضور سرورِ کائنات ﷺ سے حاصل کی۔

ایک مبتدی کو روحانی تربیت کی ابتدائی منازل میں دو قسم کے انتہائی اہم اور عملی اسباق پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک توکل علی اللہ اور دوسرا تسلیم و رضا۔ لفظ توکل کے عمومی معنی خدا پر بھروسہ ہے۔ لیکن یہ لفظ مسلمانوں کے اُس خاص طبقے نے غلط مفہوم میں استعمال کیا ہے جنہیں مذہبی رجحان والے لوگ کہا جاتا ہے۔ ہزاروں لوگ جو کوئی مفید کام کرسکتے ہیں ان کی گذر بسر زکوٰۃ اور خیرات پر ہوتی ہے اور وہ خانقاہوں اور مدرسوں میں رہتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں۔ گویا وہ کافی حد تک فقط خدا پر ہی اپنے گذارے کے ذرائع کیلئے اعتماد کرتے ہیں۔ یہ چیز ان کی خودی اور خود اعتمادی کی روح کو ختم کر دیتی ہے اور معاشرے میں بے کار افراد کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے۔ صوفیائے کرام اس لفظ کو بہت ہی مختلف انداز میں لیتے ہیں۔ جیسا کہ امام غزالیؒ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: ”جب اسرار و رموز کا پردہ اُٹھتا ہے تو بندہ مشاہدہ حق کے ذریعہ اس حقیقت تک پہنچتا ہے کہ خدا کی ہستی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ یہ علت و معلول کا سلسلہ محض توہم ہے اور یہ کہ وہی خالقِ حقیقی ہے اور کارِ بارِ حیات چلانے والی وہی ہستی ہے۔ اس پر کیف ریاست میں صوفی بیرونی اعمال کے اعتبار سے خود مختار بن جاتا ہے اور خدائے واحد پر اُس کی رضا کی خاطر مکمل

اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے۔"

یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ حاجی صاحب نے جب گھر چھوڑا تو اپنی تمام جائیداد تقسیم فرما دی تھی۔ جس مکان میں آپ نے آخری سالوں میں قیام فرمایا وہ بھی آپ کی ملکیت نہیں تھا۔ آپ کے کچھ مرید ین آپ کیلئے کھانے کا انتظام کرتے اور آپ کی خدمت میں پیش کرتے۔ لیکن آپ نے کبھی اس کیلئے بھی کسی سے کہا نہیں۔ آپ نذر نیاز قبول نہ فرماتے اور روپے پیسے کو کبھی ہاتھ نہ لگاتے۔ بعض اوقات لوگ آپ کی خدمت میں تحائف پیش کرتے۔ جنہیں آپ مسترد تو نہ فرماتے لیکن (اپنے پاس بھی نہ رکھتے اور) دوسرے لوگوں میں تقسیم فرما دیتے۔ آپ فرماتے کہ ایک فقیر کا حقیقی معیار یہ ہے کہ وہ کسی سے کچھ نہ مانگے۔ حتیٰ کے خدا سے بھی نہ مانگے۔ خدا کی محبت دوسری تمام محبتوں اور خواہشوں کو مٹا دیتی ہے۔

خدا کی رضا کی خاطر ہر شے کے ترک کیلئے آپ نے ایسے بے غرض اور بے پرواہ قسم کے زہد و تقویٰ کا نمونہ پیش کیا کہ زندگی کی ناخوشگواریوں سے ہمیشہ بے اعتنا رہے۔ کبھی کسی کیلئے حرفِ شکایت آپ کی زبان پر نہ آیا۔ حتیٰ کہ موسم کی بھی نہیں۔ جب آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو آپ کے معالج کیلئے اس سوال کا جواب حاصل کرنا انتہائی مشکل تھا کہ آپ کو کیا تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ آپ کی زبان مبارک سے کبھی کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہ نکلا کہ جس سے یہ پتہ چل سکتا کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ دریافت کرنے پر ہمیشہ فرماتے کہ ہمیں کوئی تکلیف نہیں (ہم اچھے ہیں)۔ یہ بھی پسند نہ تھا کہ دوسرے آپ کے سامنے اپنی تکالیف بیان کریں۔ بلکہ انہیں راضی برضائے خدا رہنے کی تاکید فرماتے۔ آسمانی فیصلوں میں مداخلت کے دعویٰ (جیسا کے بعض فقراء کر بیٹھتے ہیں) سے دور آپ مکمل طور پر رضائے الٰہی کے تابع تھے۔ آپ نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو قوانین فطرت وضع کئے ہیں بندہ کی ذمہ داری ان سے معاونت کرنا ہے۔ یہ ابدی و دائمی قانون کے مطابق ضبطِ نفس اور رضا و توکل کی اعلیٰ

ترین صورت ہے۔

روحانی ارتقاء کی آخری منزل فناہ یعنی ہستی باری تعالیٰ میں جذب ہوجانے کی کیفیت ہے۔لیکن ہنوز ایک بڑی کیفیت آگے ہے جسے بقا کا نام دیا جاتا ہے۔جس میں دائمی آگاہی میں مکمل فناہ کا تسلسل ہے یہ روحانی استعداد کا تاج ہے اور فناہ کی انتہا ہے۔ بعض فلاسفروں کا قول ہے کہ قدرتِ کاملہ کی حمد وثنا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اپنی ہستی کو اس طرح فناہ کرے کہ ذاتِ حقیقی میں مدغم ہوجائے۔صوفیائے کرام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کا تفکر وتصور فناہ فی اللہ کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔

☆☆☆

باب سوم

حاجی صاحب فناہ فی اللہ کی اس منزل پر تھے کہ آپ عملی طور پر اپنے آپ کو بھی بھول گئے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ آپ کبھی اپنا نام تک اپنی زبان پر نہ لائے۔ اور نہ ہی کبھی آپ نے اپنے ہاتھ سے اپنا نام لکھا۔ یہ اس حقیقت کی بین دلیل ہے کہ آپ نے اپنی ہستی کو اس قدر مٹا دیا کہ اپنے علیحدہ وجود کا احساس ہی باقی نہ رہا۔ امام غزالیؒ کے الفاظ میں ''اس (یعنی فناہ کی) حالت میں آدمی اپنے آپ کو اس حد تک مٹا دیتا ہے کہ اسے اپنے جسم اور اردگرد کی چیزوں کا احساس تک نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ یہ خیال بھی اس کے دل میں نہیں آتا کہ اس نے خود کو مٹا دیا ہے۔ سب سے عظیم حالت و کیفیت ترک ترک (فناہ و محویت کا خیال بھی مٹ جانا) ہے۔'' اس میں کچھ شک نہیں کہ یہی وہ منزل ہے کہ جس پر حاجی صاحب فائز تھے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ ''جو فناہ فی اللہ ہو جاتا ہے اسی کو عرفان الٰہی حاصل ہوتا ہے۔''

حاجی صاحب اپنے باطنی رجحان اور واردات قلبی کی وجہ سے طویل گفتگو نہ فرماتے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپ کی سوانح حیات میں کسی باقاعدہ طریق تعلیم کی تلاش عبث ہے۔ آپ ان عظیم اولیائے میں سے ایک تھے کہ جو لمحہ خدا کی شان و شوکت اور عظمت و جلالت کے تصور میں محو رہتے ہیں۔ اور ان کے دل میں کسی اور چیز کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بہر حال آپ کے سوانح نگاروں نے آپ کی کچھ تعلیمات و ارشادات کو اکٹھا کیا ہے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:۔

☆ خدا کی محبت کسبی نہیں وہبی ہے۔ (عشق میں کسب نہیں خدا کی دین ہوتی ہے۔)

☆ محبت میں انتظام نہیں۔

☆محبت میں فاصلوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اگر تمہیں ہم سے محبت ہے تو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر چہ تم ہزار میل کے فاصلہ پر بھی ہو۔ (محبت ہے تو ہزار کوس پر بھی پاس ہے۔)

☆محبت کا رشتہ ایمان اور یقین سے ہے۔ (محبت عین ایمان ہے۔)

☆خدا کی محبت کفر کو ایمان اور بے یقینی کو یقین میں بدل دیتی ہے۔

☆تمام کائنات کا انتظام عاشقانِ الٰہی کے خیال کے مطابق ہے۔

(عاشق کے خیال پر دین و دنیا کا انتظام ہے۔)

☆خدا سے بھی کچھ نہ مانگو حتیٰ کہ بھوکے مر جاؤ۔ وہ سب جانتا ہے۔ (فقیر کو چاہئے کہ اللہ سے بھی نہ مانگے۔ کیا وہ نہیں جانتا جو شہ رگ سے بھی قریب ہے..... فقیری یہ ہے کہ ہاتھ کسی کے آگے نہ پھیلائے۔ اللہ سے بھی بے پرواہ رہے۔ وہ خود ہی فرماتے ہیں: نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ وہ سب راحت و تکلیف دیکھتے ہیں۔)

☆اصل دنیا طلبی خدا کو بھلا دینا ہے۔ (جو دنیا کے انتظام میں پھنسا اس کے دل میں محبت الٰہی کی جگہ نہیں رہتی۔)

☆ایک سچے فقیر کی کوئی مرضی، پسند، حاجت یا خواہش نہیں ہوتی۔

(بڑی فقیری یہ ہے کہ ہاتھ کسی کے آگے نہ پھیلائے..... فقیر کو سول حرام ہے..... فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔)

☆اسلام اور ایمان دونوں ایک نہیں ہیں۔ (اسلام اور چیز ہے ایمان اور چیز ہے..... طریقت محتاج ملت ظاہری نہیں ہے۔)

☆ہمیشہ ایک حال میں رہو۔ (ہمیشہ ایک ہی راہ پہ چلتے رہو۔)

☆جو تم ایک دفعہ کرو۔ اسے جاری رکھو۔ (بڑی وضعداری یہ ہے کہ جو کرے وہ کئے جائے..... وضعداری بڑی چیز ہے۔)

☆خدا پر بھروسہ رکھو۔ اگر تمہیں اس پر سچا یقین ہے تو پھر اپنی روزمرہ ضروریات کے

متعلق بھی پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

☆ ایمان شک وشبہ سے پاک ہونا چاہیے۔

☆ کوئی سانس یادالٰہی سے خالی نہ جائے۔

☆ جوخدا کو یہاں نہیں دیکھ سکتے ان کو کعبہ جانے کی کیاضرورت ہے۔

☆ مسجد، گرجا، مندر سب جگہ وہی ایک خدا ہے۔

☆ خدا عرش پر نہیں۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ جو اس دنیا میں خدا کو نہیں دیکھ سکتا وہ اندھا ہے۔

☆ اگر تمہارا عشق سچا ہے تو خدا کو ان آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو۔ بغیر دیکھے کیسے محبت کروگے۔

آخری دو اشارات کا اگر ہم سینٹ جان کے پہلے مکتوب کے ساتھ موازنہ کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ ''مبارک ہیں خدا کے بیٹے (معاذ اللہ کسی کو خدا کا بیٹا کہنا شرک عظیم ہے یہ عیسائیوں کا باطل عقیدہ ہے۔ یہاں ''مبارک ہیں خدا کے مقرب ومحبوب بندے'' کہا جانا چاہئے۔) ہم جانتے ہیں کہ وہ جب ظاہر ہوگا تو ہم اس کو ویسا ہی دیکھیں گے جیسا کہ وہ ہے۔''

یہ قول صوفیائے کرام کی اکثریت کے اس مشترک ماورائی اصول کی نشاندہی کرتا ہے کہ خدائے واحد ہی موجود حقیقی ہے ماسوائے اس کے ہر شے لاموجود ہے۔ یہ صوفیائے کرام اور علمائے عظام کے درمیان ایک بہت بڑا نزاعی مسئلہ ہے۔ خود صوفیائے کرام کے درمیان بھی اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ ان میں سے ایک گروہ نظریہ ہمہ اوست (سب کچھ وہی ہے) کے خلاف ہے اور وہ اس کے برعکس نظریہ ہمہ از اوست (سب کچھ اسی سے ہے) پر یقین رکھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کائنات کی تمام اشیاء اس کی مختلف صفات کی مظہر ہیں۔ حالانکہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ جملہ تخلیق ایک ہی رشتہ احدیت میں مربوط ہے۔ بہر حال صوفیائے کرام کے اس نظریہ میں کوئی چیز بھی غیر شرعی نظر نہیں آتی۔ بلکہ اس کی تائید قرآن پاک کی اس آیت مبارکہ سے ہوتی ہے۔ خدائے بزرگ وبرتر نے فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ

سٰجِدِیْنَ ○ (ترجمہ): "جب اس کو (صورت انسانیہ میں) درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا۔" (پ ۱۴۔ سورۃ الحجر = آیت نمبر ۲۹) کتاب مقدس قرآن پاک میں ان کے لئے جو اس پر ایمان وایقان رکھتے ہیں اس مضمون کی کئی ایک آیات ہیں۔ اس حقیقت کے متعلق مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں کہ اس خاک کے پتلے میں روح خدائے بزرگ و برتر کی ہے۔ یہ بات تعجب سے خالی نہ ہوگی کہ ایک فلاسفر اپیکٹیٹس خدا کی کتاب کے نازل ہونے سے سینکڑوں سال پہلے پکار اٹھا "تو خدا کا ایک جزو ہے تیرے اندر ایک ایسی چیز موجود ہے جو اس کا جزو ہے۔ اے بدنصیب انسان تو خدا کو ساتھ لیئے پھرتا ہے لیکن اسے پہچانتا نہیں۔"

کسی شخص کے احساس اور روحانی جوہر کی نشوونما اور ارتقاء ہی صوفیاء کا اصل مقصد و مدعا ہے۔ تصوف ایک ہمہ گیر آفاقی مسلک ہے۔ لیکن حاجی صاحب نے اس کو اس قدر وسعت دی کہ جو اس سے قبل اس کو حاصل نہ ہوئی تھی۔ آپ نے ہر رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے مرد اور عورتوں کو انتہائی فراخدلی سے داخل سلسلہ فرمایا۔ آپ نے واضح الفاظ میں اعلان فرمایا کہ مسلمان، ہندو، مجوسی اور عیسائی ان کی نظر میں سب ایک جیسے ہیں۔ آپ کی بارگاہ میں ہر کوئی فطرت کے اس اصول کو بخوبی محسوس کرنے لگتا تھا کہ گویا ساری کائنات باہم مربوط ہے۔ (اور ایک کنبہ ہے۔)

ہمارے ہاں صوفیاء کے تین مشہور سلاسل قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ ہیں۔ حاجی صاحب کا تعلق پہلے دو سلاسل سے ہے۔ دوسرے صوفی درویشوں کی طرح آپ لوگوں کو تخلیہ میں بیعت نہ فرماتے۔ آپ نے مختلف مذاہب کے لوگوں کے لئے مختلف طریقہ بیعت اختیار فرمائے۔ جب آپ یہودیوں اور عیسائیوں کو بیعت فرماتے تو آپ حسب ذیل الفاظ استعمال فرماتے: "حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ تینوں خدا کے پیغمبر ہیں۔ اگر تم ان میں سے کسی ایک پر ایمان نہیں رکھتے تو اسے برا نہ کہو۔ اور اس کی ممنوعہ باتوں سے بچو۔" (دیکھو موسیٰ کلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ اور محمد رسول اللہ کسی کو برا نہ کہو اور حرام نہ کھانا۔)

قرآن پاک کے مطابق اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں میں کوئی فرق نہیں رکھا۔لہذا آپ کی تمام تر تعلیمات کلام الٰہی کے عین مطابق تھیں۔یہ بے جا نہ ہوگا کہ اگر ہم یہاں الکتاب (قرآن پاک) سے ایک اور آیت کا حوالہ دیں۔جو ناطق ہے کہ ''دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اس لئے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔'' (پ ۷۔سورۃ المائدہ= آیت نمبر ۸۲) ہر عیسائی لازمی طور پر یہ الفاظ ادا کرتا۔عیسائیت اور اسلام میں ماضی میں تصادم کے پیش نظر یہ بڑا اہم دور ہے کہ جب یورپ زمانے کے حقائق کی طرف بڑھ رہا ہے۔تو اسے چاہئے کہ اسلام کے متعلق اپنے نظریات پر نظر ثانی کرے اور اسلام کا بنظر غائر مطالعہ کرے اور اس کے ساتھ ساتھ قدیم تعصبات اور کم علم یورپی مصنفین اور خصوصاً پادریوں کے پھیلائے ہوئے غلط تصورات کو ایک طرف پھینک دے۔یورپی سیاستدانوں (اور مدبروں) کے لئے ایک غور طلب مسئلہ ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان ایک بڑا اتحاد ایک بہت بڑا سیاسی اثاثہ بن سکتا ہے۔

ہندوؤں سے آپ فرماتے ''برھما پر ایمان لاؤ۔بت پرستی نہ کرو۔دیانت دار بنو۔'' (برہم پہچانو۔پتھر نہ پوجو اور جھٹکا نہ کھاؤ۔) آپ کے ہاں من وتو کا فرق نہ تھا۔(آپ کے نزدیک مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں کوئی فرق نہ تھا۔) ہزاروں ہندو جن میں مختلف پنتھ کے سادھو اور فقیر بھی شامل تھے۔انہوں نے آپ کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا اور آپ کے سلسلہ میں بیعت ہوئے۔آپ ہمیشہ انہیں ان الفاظ کے ساتھ خوش آمدید کہتے کہ ''ہم اور تم ایک ہیں۔'' آپ ہر فرد میں خدا کو موجود سمجھتے۔کیونکہ آپ نے پہلے اسے اپنے عرفان نفس سے پالیا تھا۔(بمصداق من عرف نفس فقد عرف ربہ) آپ غیر مسلموں کو اپنا مذہب ترک کرنے کا نہ کہتے اس کے برعکس آپ انہیں انتہائی جوش وجذبہ اور خلوصِ نیت کے ساتھ اس پر چلنے کی نصیحت فرماتے۔جن کا تعلق کسی پیشہ یا تجارت سے ہوتا انہیں نصیحت فرماتے ہوئے ان کے کام کے اعتبار سے

مزید الفاظ کا اضافہ فرماتے۔اگر کوئی شخص بیعت ہونے کے بعد تارک الدنیا ہو کر مکمل طور پر روحانی زندگی گزارنے کا اظہار شوق کرتا تو آپ اسے تہبند عطا فرماتے۔(اپنے احرام جیسا لباس جو آپ کے سلسلہ کا ایک مسلمہ امتیازی نشان بن گیا) اور کچھ زبانی ہدایات دیتے اور اسے کسی دور دراز مقام پر بھجوا دیتے جہاں وہ رہے اور ہدایات کے مطابق عبادت و ریاضت کرے۔ زہد وتقویٰ کی پابندیاں جو مبتدیوں کو سہنی پڑتی تھیں ہمیشہ سخت تصور کی جاتی تھیں۔مثال کے طور پر ایک شخص (حافظ گلاب شاہ وارثی اکبر آبادی) کو فرمایا کہ اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھنا۔(آنکھ بند نہ کرو بیدار رہو) جس کا مطلب یہ تھا کہ آدمی نفس کشی کیلئے ذاتی راحت وآرام کی خاطر سکون کی نیند تک ترک کر دے ایک اور شخص (مرآت شاہ بھاگل پوری) کو ہدایت فرمائی کہ ہر قسم کی غذا چھوڑ دے اور جنگلی اشیاء پر گزر اوقات کرے۔ایک مدت معینہ کے بعد وہ خوراک کی طلب ہونے پر ان پھلوں کو فقط سونگھ سکتے تھے۔اور آخری مرحلہ پر وہ ان چیزوں کو فقط دیکھ سکتے تھے۔(ان سے ارشاد فرمایا کہ پہلے وہ چیز کھا کر پیٹ بھریں جو اپنی جنس کا تخم ہو مثلاً آلو، اروی، شکر قندی وغیرہ کیونکہ یہ خود تخم ہیں ان کو کھایا جائے تو گویا ان کا تخم قطع ہوا۔ہاں آم خربوزہ اور کدو وغیرہ کا مغز کھائیں اور تخم کی حفاظت کریں۔ جب اس کی عادت ہو جائے تو مغز کا کھانا ترک کر دیں اور وضع اشتہا کیلئے پھلوں کو سونگھ لیا کریں۔ جب اس پر قدرت ہو جائے تو سونگھنا بھی ترک کر دیں اور تسکین نفس کیلئے صرف دیکھ لیا کریں جب اتنی قوت ہو جائے تو دیکھنا اصل بھوگ میں جوگ ہے۔) آپ کی تعلیم ہر ایک کیلئے یکساں نہ تھی۔ بلکہ ہر فرد کیلئے اس کی استطاعت کے مطابق مختلف تعلیم ہوتی۔جنہیں باقاعدہ اور باضابطہ طور پر سلسلہ کا لباس (احرام) عطا فرماتے ان کا نام تبدیل فرما دیتے۔اس سلسلے میں (احرام پوشی کی) تقریب جس کا انعقاد حاجی صاحب کے مریدین کیا کرتے تھے اس کا حوالہ یہاں بے جا نہ ہوگا۔جب ان میں سے کوئی نیا احرام لاتا تو آپ سے احرام تبدیل کرنے کی درخواست کرتا۔جو احرام آپ اُتارتے وہ مریدین لے

لیتے۔اس کی قدر ومنزلت کا یہ عالم ہوتا کہ یہ ناممکن تھا کہ پورا احرام کسی کو مل جائے۔یہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔جو بطور تبرک تقسیم ہو جاتا۔بے پناہ عقیدت اور شیفتگی کی وجہ سے بعض اوقات اس تبرک کو حاصل کرنے کی خواہش وکوشش اس قدر ہو جاتی کہ آپ کو ایک ہی دن میں کئی کئی مرتبہ احرام تبدیل کرنا پڑتے۔بعض اوقات آپ کی خدمت میں احرام ساز وآواز (کویوں یا قوالوں) کے ہمراہ پیش کیا جاتا۔

آپ کے پیروکاروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک خرقہ پوش (جنہوں نے زہد وفقر کی زندگی اختیار کی) اور دوسرے دنیا دار افراد (جنہوں نے آپ کا مسلک وعقیدہ تو اختیار کیا لیکن اس اعتبار سے ان کی طرز زندگی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ آئی۔)خرقہ پوشوں (احرام پوشوں) کی بھی مزید کئی اقسام ہیں۔ایک وہ کہ جنہوں نے آپ (حاجی صاحب) سے معرفت کی تعلیم وتربیت مکمل کر لینے پر احرام پایا۔اور دوسرے وہ کہ جنہوں نے آپ کی اجازت ومنظوری کے بغیر احرام پہنا اور جو روحانی تربیت سے مکمل طور پر بے بہرہ اور نابلد تھے۔

دنیا دار افراد کی تعداد خرقہ پوشوں کی نسبت زیادہ ہے۔آپ کے سوانح نگار اس کے معترف ہیں کہ آپ کے مریدوں کی تعداد اب بتانا امر محال ہے جو کہ تمام براعظم ایشیا اور یورپ کے کچھ حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک چار لاکھ کی تعداد بیان کرتے ہیں۔لیکن اگر ہم دوسری تعدادوں کو درست خیال کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے احتیاط کا دامن چھوڑ دیا۔حاجی صاحب نے کسی کو داخل سلسلہ ہونے کے لیئے کبھی ترغیب دی۔آپ جہاں بھی جاتے عزت وتکریم پاتے۔آپ کی مسحور کن شخصیت سب کو متاثر کرتی۔عوام،امیر،غریب،تعلیم یافتہ اور ان پڑھ آپ سب میں یکساں مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔اس بات سے یہ اصول سمجھ میں آتا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ ساری دنیا تم سے محبت کرے۔تو تمہیں چاہیے کہ پہلے تم تمام اہل عالم سے محبت کرو۔ریلوے سٹیشن ہو یا قصبوں کی گلیاں آپ جہاں بھی تشریف لے جاتے بے پناہ ہجوم لگ آتا۔کہا جاتا ہے کہ

اپنے پہلے سفر دربھنگہ کے موقع پر جس مکان میں آپ قیام فرما تھے وہاں (مشتاقان دید کا) اس قدر رش ہوا کہ اس عمارت کا ایک بہت بڑا دروازہ دفعتاً گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور آپ کو عمارت کے ایک دوسرے حصہ میں منتقل ہونا پڑا۔ زائرین (مشکوۃ حقانیت کے مطابق جن کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی) سارا دن داخل سلسلہ ہوتے رہے لیکن ہجوم کسی طرح کم ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ جب آپ وہاں سے رخصت ہوئے تو تقریباً دس ہزار آدمی آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ رستے میں رکے اور فرمایا کہ ہماری پالکی کسی بلند ٹیلہ پر رکھ دو (جس کو مرید ہونا ہو وہ ہماری پالکی کو چھو لے نیز فرمایا کہ جو پالکی کو چھو لے گا وہ داخل سلسلہ ہو جائے گا۔) چنانچہ لوگ پالکی کو ادب و تعظیم سے چھوتے ہوئے گزرتے جاتے اور آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوتے جاتے۔ ایک اور موقع پر ایک ریلوے سٹیشن پر اس قدر ہجوم تھا کہ کسی کا آپ تک پہنچنا محال تھا۔ لیکن ہر شخص متمنی تھا کہ آپ کے قریب پہنچے اور حلقہ بیعت میں داخل ہو۔ آپ نے اردگرد نگاہ دوڑائی اور فرمایا "جاؤ تم سب ہمارے مرید ہو۔" (جاؤ ہم نے سب کو اپنی بیعت میں قبول کر لیا۔) جب ہجوم بہت زیادہ ہو جاتا اور مروجہ طریقۂ بیعت سے ہر شخص کو مرید کرنا محال ہو جاتا تو ایک رسی یا چادر (پالکی یا مکان سے) باہر نکال کر پھیلا دی جاتی اور آپ فرماتے کہ "جو شخص اس کو چھو لے گا وہ ہمارا مرید ہے۔"

آپ کے یورپین مریدین کہ جنہوں نے آپ سے کچھ تربیت پائی۔ ان میں سے تین ولائتی شاہ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر جانسٹن جو یو پی میں ایس۔ پی تھے نیز متعدد اینگلو انڈین آپ کے حلقہ بیعت میں داخل تھے۔ آپ کے پارسی مریدین میں سے ایک جونو مذہب تھا جسے مصنف اچھی طرح ذاتی طور پر جانتا تھا۔ وہ اسلامی علوم کا خاصا ماہر تھا۔ ایک عجیب و غریب داستان ایک شریف النفس عالی مرتبہ ہسپانوی کی ہے جس کا نام کاؤنٹ گلارزا تھا۔ جو فقط حاجی صاحب کی زیارت و ملاقات کیلئے سپین سے آیا تھا اور لندن میں حلقہ ارادت میں شامل ہوا تھا۔ حاجی صاحب

کے ایک مرید (مسٹر حبیب احمد سابقہ مہتمم روزنامہ دہلی مقیم لندن) جو روحانیت میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے اپنے روحانی کمالات کا مظاہرہ کیا۔ یہ دونوں اکثر اکٹھے رہتے تھے۔ حضرت اقدس کی عظمت و بزرگی کے احوال سن کر کاؤنٹ کے دل میں شوق زیارت پیدا ہوا۔ اس نے ایک مسلمان طالب علم (جو حاجی صاحب کے مرید تھے اور بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر کے انڈیا واپس آ رہے تھے ان کے ذریعہ آپ سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ یوں کاؤنٹ دیوہ شریف حاضر ہوا۔ ملاقات کے دوران حاجی صاحب نے اس سے فرمایا ''تم آئے اور ہم سے ملے، تمہارا آنا مبارک ہو، ہم اور تم وہاں ایک جگہ ہوں گے۔'' (بمصداق حدیث مبارکہ: المرء مع من احب)

معلوم ہوتا تھا کہ کاؤنٹ کی اس ملاقات سے تسلی و تشفی ہوگئی۔ کیونکہ واپسی پر پیرس سے اس نے حاجی صاحب کے ایک مرید (فقیر اوگھٹ شاہ وارثی) کو دیوہ شریف میں تحریر کیا کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے مرشد کریم روحانیت کی راہ پر ازل سے ابد تک اس کے ساتھ ہیں۔

حاجی صاحب کے مریدین میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں کہ جو ہندوستان کے ساتھ ساتھ انگلستان کی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے کچھ نے تو انتہائی اعلیٰ، ممتاز اور نمایاں مقام پایا۔

ابتدائے آفرینش سے کوئی پیغمبر یا درویش ایسا نہیں گزرا کہ جس کے مخالفین نہ ہوں اور جسکے طرز عمل پر مخالفانہ تنقید نہ کی گئی ہو۔ اس کے باوجود کہ آپ درویشی اور وسیع المشربی کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن پھر بھی ظاہر پرست مسلمانوں کا ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ آپ شرع کے پابند نہیں ہیں۔ آپ پر لگائے جانے والے الزامات میں سب سے بڑا یہ تھا کہ آپ باقاعدگی اور پابندی سے نماز ادا نہ کرتے تھے (دن میں پانچ دفعہ) اور آپ ہر قسم کے لوگوں کو (یعنی ہر مذہب و ملت اور رنگ و نسل اور امیر و غریب کو) بیعت کر لیتے تھے۔ ایسے لوگوں کو بھی جن میں صحیح تعلیم کا فقدان تھا لہٰذا وہ مذہبی فرائض کی ادائیگی میں

بڑی غفلت و سستی برتتے۔ پہلا الزام کچھ مولوی صاحبان کی بدخواہی وکینہ وری اور کسی حد تک غلط فہمی وناسمجھی پر مبنی تھا۔ یہ درست ہے کہ حاجی صاحب عام مسلمانوں کی طرح (با جماعت مسجد میں) نمازیں نہیں پڑھتے تھے لیکن بعض اوقات ان کے ساتھ بھی ادا فرماتے لیکن اس بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں کہ آپ نے کبھی مروجہ و مسلمہ مذہبی عقائد سے انحراف کیا ہو۔ آپ کتاب الٰہی کے سختی سے پابند تھے۔ اگر آپ بظاہر قانون شریعت کے الفاظ پر دھیان نہ دیتے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ پر ہمیشہ مافوق البشری کیفیت طاری رہتی۔ صوفیانہ تعلیمات کے مطابق ایک صوفی درویش جب سکر (سرشاری و بے خودی) کی کیفیت میں ہوتو اس وقت وہ مذہبی رسومات وعبادات سے مستثنیٰ قرار پاتا ہے۔ (یعنی حالت سکر میں فرائض مذہبی کی پابندی ساقط ہوجاتی ہے۔) یہ نشہ، سرشاری، مدہوشی اور بے خودی کی اصطلاح اس شخص کیلئے استعمال کی جاتی ہے جو عشق الٰہی کے نشہ سے سرشار ہو۔ نیز یہ اس کے لئے استعمال کی جاتی ہے جس کی کیف ومستی حب الٰہی پر دلالت کرتی ہو۔ یہ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے کہ جس میں تمام انسانی خصوصیات فناہ ہو جاتی ہیں اور بندے کو خدا کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ جب ایک صاحب علم وفضل شخصیت کی روحانی وباطنی آنکھ کھلتی ہے تو اس کی ظاہری جسمانی آنکھ بند ہو جاتی ہے۔ حاجی صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں باری تعالیٰ کو کن الفاظ میں مخاطب کروں۔ کیا وہ موجود نہیں کہ یوں تصنع اور دکھاوے کی نمازیں ادا کی جائیں۔ آپ محض ظاہرداری نمود ونمائش اور رسوم ورواج کو ناپسند فرماتے اور عظیم رومی سے اتفاق کرتے ہوئے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ''بیوقوف مساجد میں تو حمد وثنا کرتے ہیں لیکن دل کے سچے معبد کو نظر انداز کر دیتے ہیں''۔ اسی طرح کے ایک روایتی سوال پر آپ نے ایک دفعہ ایک عالم دین کو جواب دیتے ہوئے فرمایا ''اگر کوئی خدا کو دیکھ کر سجدہ کرے تو وہ کافر کہلاتا ہے لیکن جو بے دیکھے سجدہ کرے وہ سچا مومن کہلائے'' (علمائے ظاہر کی بھی کیا الٹی چال ہے کہ جو دیکھ کر سجدہ کرے اس کو تو کافر کہتے ہیں اور جو بے دیکھے سجدہ کرے وہ مومن کہلائے اسی کو

اندھا پن کہتے ہیں بلکہ حق یہ ہی ہے کہ جو دیکھ کر سجدہ کرے وہی مومن ہے۔)

دوسرے الزام کے ضمن میں یہ بات درست ہے کہ آپ تمام فرقوں اور مذاہب کے لوگوں کو بیعت فرما لیتے تھے۔ یہ قدیم مروجہ طریقہ کار کے خلاف معمول ہوتا مگر یہ ایک جدت تھی اور آپ کی عظیم روحانی قوت کا مظہر تھی۔ اس کے علاوہ یہ ایک عظیم مقام کی نشانی تھی۔ دوسرے صوفی درویشوں کی نسبت آپ میں وسعت نظر بہت زیادہ تھی۔ آپ پہلی ہستی تھے کہ جنہوں نے تصوف کی راہ کو مختلف فرقوں، مذاہب اور مسالک کے لوگوں کے لئے کھول دیا تا کہ وہ اس پر گامزن ہو سکیں۔ اس معاملہ میں آپ اولیائے کرام کی صف میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی طرح جو ادنیٰ طبقہ کے لوگوں اور گنہگاروں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ حاجی صاحب بھلے برے سب کو اپنی آغوش رحمت میں جگہ دیتے۔

وہ لوگ جو اندر سے ایمان والے ہیں وہ ہر ایک میں سے اچھائی نکال لیتے ہیں جو ان کے قریب آتا ہے۔ آپ مثالوں کے ذریعے تربیت فرماتے نہ کہ پند و نصائح سے، عملی زندگی کے ذریعہ نہ کہ غیر مدلل تعلیمات کے ذریعہ کہ انہیں کیسے زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ زندگی میں آرٹ کی طرح فقط عملی تربیت ہی فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ ہمارے پیغمبر پاکؐ نے جس چیز کی تعلیم دی اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اور یہی حال آپ کے پیش رو پیغمبروں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا تھا۔ آپ اپنے مریدین کو تاکید فرماتے کہ خدا کی عبادت فقط عبادت سمجھ کر کرنی چاہیے نہ کہ کسی انعام واجر کی خاطر۔ اس سے زیادہ ارفع اور اعلیٰ روحانی تعلیم کا تصور انتہائی مشکل ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے مریدین کے لئے جو نصب العین مقرر کیا وہ اس قدر ارفع و اعلیٰ تھا کہ عام انسان کا وہاں تک پہنچنا مشکل تھا لیکن اس تعلیم سے کس قدر عام اخلاقی نشوونما ہوئی اس کا اندازہ محال ہے۔

حاجی صاحب نے اپنے متعلق کبھی غیر معمولی قوتوں (کرامات) کا دعویٰ

نہیں کیا۔لیکن ایسے بے شمار واقعات ریکارڈ میں موجود ہیں کہ آپ کی محض ایک نگاہ سے یا مس کرنے سے مریض شفا پا گئے۔جو باتیں آپ سے روزمرہ زندگی میں سرزد ہو جاتی تھیں وہ بھی انسانی قوت سے بالاتر محسوس ہوتی تھیں۔ایک مرتبہ بہرائچ جاتے ہوئے رستے میں آپ نے چاہا کہ دریائے گھاگرا پار کریں۔لیکن گھاٹ پر کوئی کشتی موجود نہ تھی۔آپ نے فیصلہ کیا کہ ہمراہیوں کے ساتھ تیر کر دریا کے پار چلے جائیں۔ہمراہی انتہائی سخت خوف کے عالم میں تھے اور ساتھ چلنے سے ہچکچاتے تھے۔لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے کہ پانی صرف گھٹنوں تک گہرا تھا۔چنانچہ وہ نہایت اطمینان سے پانی سے گذر گئے۔آپ کی خدمت میں رہنے والوں کا روزمرہ کا ایک مشاہدہ تھا کہ جس پر شاید اب کوئی یقین نہ کرے کہ آپ کے پاؤں پر کبھی گرد کا نشان تک نہ ہوتا حالانکہ آپ ہمیشہ ننگے پاؤں چلتے تھے۔جب آپ قالین پر چلتے تو آپ کے پاؤں کا کبھی کوئی نشان یا دھبہ تک اس پر نہ پڑتا۔اکثر لوگ اس پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ان میں سے کچھ نے حاجی صاحب کو آزمائش کے لئے اپنے گھر مدعو کیا۔انہوں نے سفید چاندنی کا فرش بچھایا اور مکان کے سامنے میدان میں خوب پانی چھڑکا دیا۔ان کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ آپ کی واپسی کے بعد انہوں نے بڑی احتیاط سے مشاہدہ کیا لیکن وہ چاندنی پر کسی بھی قسم کے کیچڑ وغیرہ کے نشانات تک نہ پا سکے۔جن کا یقین تھا۔اس حقیقت کے بے شمار چشم دید گواہ ابھی تک زندہ ہیں جن کی صداقت اور راست بازی پر کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں کیا جا سکتا۔

جب انسان فنا فی اللہ ہو جاتا ہے تو غیر ارادی طور پر اس سے قوت الٰہی کا اظہار ہونے لگتا ہے۔اس مقام پر پہنچ کر بندے کی مرضی خدا کی مرضی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اور اس سے اتحاد کی وجہ سے یہ انتہائی طاقتور اور قوی ہو جاتی ہے۔پھر اس سے غیر معمولی افعال سرزد ہونے لگتے ہیں جنہیں معجزہ یا کرامت کہتے ہیں۔یہ ارواح تین طریقوں سے عام انسانوں کی روحوں سے مختلف ہوتی ہیں۔

۱۔ جو کچھ دوسرے خواب میں دیکھتے ہیں وہ یہ عالم بیداری میں دیکھتے ہیں۔
۲۔ دوسرے لوگوں کے ارادوں کے اثرات فقط ان کے اپنے اجسام پر ہوتے ہیں لیکن ایک ولی اللہ اپنی قوت ارادی سے اپنے علاوہ دوسروں کے اجسام پر بھی اثر انداز ہوسکتا ہے۔
۳۔ جو علم دوسرے پڑھ کر حاصل کرتے ہیں وہ ان کو خود بخود (وجدان سے) حاصل ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث قدسی کی رو سے فرمان الٰہی ہے کہ "میرا بندہ جو میرے قرب کا متلاشی ہو اور چاہے کہ میں اسے اپنا دوست بنالوں تو میں اس کا کان، اس کی آنکھ اور اس کی زبان بن جاتا ہوں۔" (صحیح بخاری)

حاجی صاحب کی زندگی میں حضرت عیسیٰؑ کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ تصوف کے بعض ماہر مستند مصنفین کا قول ہے کہ بعض اوقات ولی کسی پیغمبر کو اپنے لئے نمونہ بنالیتا ہے اور اس پیغمبر کی زندگی کے کچھ خاص پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پیغمبر کی بعض خصوصیات اس میں جذب ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے انہیں ولایت ابراہیمیؑ، ولایت عیسویؑ، ولایت محمدیؐ وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئی بات خلاف مذہب نہیں کہ حاجی صاحب نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنے لئے مثال بنایا جو کہ روحانیت کی ایک علامت تھے۔ جس طرح کہ پیغمبر اسلامؐ میں اپنی مخصوص خوبیوں اور قوتوں کے علاوہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی تمام خصوصیات بھی موجود ہیں۔ اسی طرح اگر ایک مسلمان ولی اللہ میں حضرت عیسیٰؑ کی بعض خصوصیات موجود ہوں تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایک سچا مسلمان ہونے کے علاوہ اس میں حضرت عیسیٰؑ کی بعض خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ بلاشبہ ریگستان کے فرزندوں کو یورپ کے عیسائیوں سے زیادہ حضرت عیسیٰؑ سے مناسبت ہے۔ ایک ولی اللہ کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک یہ ہوتی ہے کہ وہ مریدوں اور دوسرے لوگوں پر محض ہاتھ یا لباس مس کرنے سے ان پر اثر ڈال سکتا ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ آپ اس عجیب و غریب طریقہ سے لوگوں کو داخل سلسلہ فرمایا کرتے تھے کہ جس نے لباس کے دامن کو

یا آپ کی طرف سے پھینکی گئی رسی کے سرے کو چھو لیا وہ بھی داخل سلسلہ ہو گیا۔ آپ اکثر اپنی خوشی کا اظہار پیٹھ ٹھونکنے یا گھونسہ مارنے سے فرماتے تھے۔

ہندوں آپ کو شری کرشن کا اوتار سمجھتے تھے۔ جبکہ آپ کے بعض عظیم ہم عصر آپ کو قرون اولی کے اولیائے کرام کے ہم پلہ خیال کرتے تھے۔ وہ سب آپ کے مدارج اعلیٰ کے قائل تھے۔ فقط اتنا ہی کافی ہو گا کہ یہاں بطور مثال آپ کے معاصرین میں سے ایک حضرت مولانا شاہ محمد اکمل آفندی بغدادیؒ کی رائے سے یہ اقتباس پیش کر دیا جائے:۔

''اس زمانہ میں کوئی حاجی صاحب کا ثانی نہیں ہے ان کا عرفان اس قدر زیادہ ہے کہ جس کی انتہا نہیں ہے۔ میں نے بہت سے فقراء و مشائخ کو دیکھا ہے (اور جہاں تک غور کیا ہے ان کے مدارج کی انتہا نہیں ملی۔ ان کی اعلیٰ درجہ کی تکمیل ہوئی ہے۔) میں نے بہت سیاحی کی ہے مگر ایسا خاص اور مکمل بزرگ دیکھنے میں نہیں آیا جو ان کے مقام و مرتبہ کو پہنچ سکے۔'' (بحوالہ مشکوٰۃ حقانیت)

☆☆☆

باب چہارم

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کا مقصد حیات کیا تھا؟ کیا وہ دور جس میں آپ کی ولادت ہوئی اور آپ نے زندگی گزاری وہ ایک ولی اللہ کی پیدائش کے لئے موزوں تھا؟ ہندوستان کی انیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف کی تاریخ، انگلستان کی تاریخ سے بہت زیادہ مربوط ہے۔ جب ہندوستان کی حکومت تاج برطانیہ کے سایہ میں آ گئی تو یقدرتی بات تھی کہ زمانہ وکٹوریہ کی سائنسی تحقیقات اور علمی رجحانات کا اثر اس ملک پر بھی پڑے۔ یوں ہمارے ہاں انگریزی تعلیم (مغربی علوم) کا سورج طلوع ہوا۔

مشرق کی سالہا سال کی دماغی غفلت کو مغربی خیالات نے دفعتاً چونکا دیا۔ جہاں تک یو۔پی (آگرہ اور اودھ) کا تعلق ہے تو مغربی تہذیب وثقافت کے مسلمہ علمبردار سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ موجودہ نسل کو مغربی تہذیب میں ڈھالنے کے لئے انہوں نے کانٹ چھانٹ والا چاقو سب سے پہلے مذہب پر استعمال کیا۔ انہوں نے کوشش کی کہ قدیم نظریات اور روایات کو رد کر کے اسلام کو یورپین سائنس اور فلسفہ کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ اس نئی تحریک نے جس کو راسخ العقیدہ علمائے کرام اصطلاحاً نیچری تحریک بھی کہتے ہیں اس نے مذہب کی بنیادوں کو ہلا ڈالنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن قدرت ہمیشہ ایسے ماحول کا علاج خود کر دیتی ہے۔ خیالات واعتقادات کی گڑبڑ کے اس دور میں جہاں ایک طرف دنیا کا رجحان مادیت کی طرف بڑھتا جا رہا تھا دوسری طرف روحانیت کا محیر العقول منظر سامنے آ گیا۔ حاجی صاحب کوئی مولوی یا واعظ نہ تھے۔ انہوں نے اپنے کسی قول وفعل سے انگریزی تعلیم کی ترویج واشاعت کی مخالفت نہیں کی۔ حاجی

صاحب اور سر سید احمد خان کی ملاقات کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ حاجی صاحب ایک مرتبہ علی گڑھ تشریف لائے۔ سر سید نے جب آپ کی تشریف آوری کا سنا تو آپ کی خدمت میں خلوت میں ملاقات کے لئے عرضداشت بھیجی۔ انہیں شام کے وقت آنے کے لئے کہا گیا۔ سر سید رات کے کھانے کے بعد کافی دیر سے پہنچے اور دروازہ پر دستک دی۔ خدام میں سے کسی نے پوچھا کہ کون ہے؟ آنے والے نے جواب دیا کہ ''شیطان''۔ حاجی صاحب نے فوراً دروازہ کھلوایا اور بہت تپاک سے ملے۔ ملاقات معمول سے زیادہ دیر تک جاری رہی۔ سر سید نے شکایت کی کہ میرے ہم مذہب مجھے بدعتی، مرتد اور کافر کہتے ہیں۔ حاجی صاحب نے فرمایا ''سید کبھی کافر نہیں ہوسکتا۔'' نیز فرمایا کہ ''مجھ کو انگریزی تعلیم سے اختلاف نہیں ہے مگر محبت اخلاص اور طلب روحانیت ضروری ہے۔'' حاجی صاحب انگریزی داں طبقہ میں اسی قدر محبوب تھے جس قدر پرانے خیال کے لوگوں میں۔ سینکڑوں انگریزی داں آپ کے گرد جمع رہتے اور آپ کے قدموں میں بیٹھتے (اور سر عقیدت آپ کے پائے مقدس پر جھکاتے)۔ آپ پہلے صوفی درویش تھے جو سمندر پار کر کے یورپ تشریف لے گئے اور آپ ہی پہلے صوفی تھے کہ جن پر انگریزی داں طبقہ فریفتہ تھا۔ یہ اس بات کا نمایاں ثبوت ہے کہ انیسویں صدی کے بیشتر حصے پر چھایا رہنے والا آپ کا وجود مادیت کی برتری اور ترقی کے خلاف ایک عملی احتجاج تھا اور آپ راستی و پاکدامنی کے ایسے مظہر تھے کہ آپ کے سامنے منکرین کی ساری قوت ختم ہوجاتی تھی۔

آپ نے لوگوں کو داخل سلسلہ کرنے کا کام اپنی زندگی کے آخری لمحے تک جاری رکھا۔ اور آپ نے 7 اپریل 1905ء کو مختصر علالت کے بعد وفات پائی۔ جب آپ کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو انسان محو حیرت رہ جاتا ہے۔ اسی (80) سال کی ریاضت، سات دن کا روزہ، پا پیادہ سفر، لامتناہی مسافت، بیدار راتیں، یاد الٰہی سے کوئی سانس خالی نہیں، دل محبت کا گہوارہ اور سر تا در مطلق خالق کائنات کی تسلیم و رضا کے لئے

خم۔آپ مملکت صوفیہ کے فرمانروا تھے۔آپ کی بے پناہ انسان دوستی اور ہمدردی نے مذہب کے مصنوعی اختلاف کو ختم کر دیا۔اور ہر مذہب وملت کے لوگوں کو اپنے مقدس سلسلے میں داخل فرمایا۔آپ نے اپنے خاموش عمل سے وہ کامیابی حاصل کی جو زبان وتلوار سے بھی حاصل نہ ہو سکتی تھی۔آپ کا مقصد حیات خدا کی محبت کے پیغام کے ساتھ ساتھ آفاقی محبت بھی پھیلانا تھا۔آپ نے یہ تعلیم اپنے عمل کے ذریعہ دی (یعنی سب سے محبت کی) یوں آپ نے مختلف مذاہب کے انسانوں کو ایک ہی جھنڈے تلے جمع کر دیا۔اور خواہشاتِ نفسانی پر غلبہ پا کر اپنی محدود اور فناہ ہو جانے والی ہستی کو لامحدود اور ہمیشہ باقی رہنے والی ذات باری تعالیٰ میں جذب کر کے یہ ثابت کر دیا کہ انسان کے اندر خدا موجود ہے۔

آپ اسی مقام پر دفن کئے گئے جہاں آپ نے وفات پائی۔اب وہاں ایک عالیشان مقبرہ تعمیر ہے جو اودھ کے سب سے عمدہ مقبروں میں سے ایک ہے۔آپ کے جاں نثار پیروکاروں نے آپ کی یاد میں یہ عظیم الشان عمارت تعمیر کی ہے۔مزار اقدس کی سیڑھیوں پر روزانہ زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے لیکن سالانہ عرس کے موقع پر جب ایک مذہبی میلہ بھی دیوہ شریف میں لگتا ہے۔مجمع کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔سلسلہ مسلسل ترقی پا رہا ہے۔ہر سال عرس کے موقع پر کثرت سے نئے لوگ داخل سلسلہ ہوتے ہیں۔باضابطہ طور پر بیعت کی رسم اس موقع پر موجود فقراء میں سے سب سے بزرگ احرام پوش فقیر کے ہاتھوں ادا کی جاتی ہے۔کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:۔

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود

سالہا سجدہ صاحب نظران خواہد بود

(ترجمہ: تیرے نقش کف پا پر صاحب نظر سال ہا سال سے سجدہ کناں ہیں۔تشریح: وہ کہ جنہوں نے خود کو اپنے قلب ونظر اور خواہشات سمیت تمہارے لئے وقف کر دیا ہے جو سالہا سال سے تیرے قدموں کے نشان پر جھکے ہوئے ہیں اور اپنا ماتھا رگڑ رہے ہیں ان پر نگاہ لطف وکرم فرمایئے۔)

حاجی صاحب کے وصال پر آپ کی جانشینی کے متعلق ایک تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ نتیجتاً اس کے متعلق عدالت میں دعویٰ دائر کیا گیا اور ایک ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا۔ یہ بات محفوظ ذرائع سے ثابت شدہ ہے کہ آپ نے اس کا عام اعلان فرما رکھا تھا کہ آپ کا کوئی جانشین نہیں ہے۔ آپ نے درج ذیل الفاظ ارشاد فرمائے: ''محبت رسمی راستی سے بہتر ہے۔ میرا مسلک عشق ہے اور عاشق کا کوئی جانشین نہیں ہوتا۔'' یہ ضروری نہیں کہ ہر صوفی درویش یا شیخ کا ضروری کوئی خلیفہ یا جانشین ہو۔ سجادہ نشین مقرر کرنے کے اصول کا اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ سلف صالحین کی باطنی تعلیم کا روحانی سلسلہ آگے چلتا رہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں مذہبی و روحانی اعتبار سے ہدایات کا اضافہ ہوتا رہے۔ قدیم صوفیائے کرام کے دور میں خانقاہ یا مسجد بطور درسگاہ بھی استعمال ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک سجادہ نشین کے لئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہوتا تھا۔ تعلیم کے علاوہ اُسے دیندار، پارسا اور متقی بھی ہونا چاہیے تھا۔ اگر کوئی شیخ کسی کو اپنا خلیفہ نامزد نہ کر سکتا تو بعض اوقات اس کے مریدین میں سے جو اس مقصد کے لئے زیادہ اہل ہوتا اسے اس سلسلہ کے مریدین کی اکثریت منتخب کر لیتی۔ حاجی صاحب ان لوگوں میں سے نہیں ہیں کہ جو اپنے متعلق یا اپنی تعلیمات کی تفصیلات پر کچھ لکھتے۔ لیکن ہم آپ کے بے شمار قابل تعریف مریدین کے بے حد ممنون ہیں کہ جنہوں نے آپ کی زندگی کو سمجھا۔ وہ لوگ کہ جو آپ کے حالات زندگی اور تعلیمات کے متعلق جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے دو کتابیں تجویز کی جاتی ہیں:۔

۱۔ مشکوٰۃ حقانیت المعروف بہ معارف وارثیہ (از مولانا شیخ فضل حسین صدیقی وارثی نادی)

۲۔ منہاج العشقیہ فی ارشاد الوارثیہ (از مرزا محمد ابراہیم بیگ شیدا وارثی لکھنوی)

میں انتہائی تعظیم و تکریم اور عاجزی و انکساری کے ساتھ اس اعتراف کے بغیر اپنی بات کو ختم نہیں کر سکتا کہ میں اس موضوع کے ساتھ صحیح انصاف نہیں کر سکا جس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ حاجی صاحب ان عظیم ہستیوں میں سے ایک تھے کہ جو خدا کے خاص اور مقرب بندے ہیں جو ہمارے عقل و شعور اور سمجھ سے دور لیکن درحقیقت ہمارے قریب ہیں۔